

# ماہِ خ

PDFBOOKSFREE.PK



رضیہ بیٹ

اُنے  
معصوم کلیوں کے نام  
چو  
میرے گلشنِ حیات میں  
مہک رہی ہیں —

## تترتیب

۹	سبزنگ.....
۳۲	اُن یہ مرد.....
۴۷	ساڑھی.....
۶۴	پہلی تاریخ.....
۸۷	بھول.....
۱۱۳	تلخیاں.....
۱۵۳	بوجھ (۱۹۴۴ء).....
۱۹۳	ماہ رُخ.....

## سبز رنگ

کمرے کی دیواروں پر سبز ڈسٹمپر ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کا روغن سبز ہے۔ پردے، قالین اور فوم کا خوبصورت بیڈ بھی سبز رنگ کے مختلف ٹیڈوں میں ہے۔ گدے دار کرسیاں بھی سبزی مائل ہیں۔ آئینے والی بڑی سی الماری کا رنگ بھی ہلکا سبز ہے۔ ساحرہ سبز بوتلوں والی فریج ٹیلیفون کی خوبصورت ساڑھی پہنے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے حسین خدوخال کا جائزہ لے رہی ہے۔ ریشمی جھالروں والے بیڈ پر اس کا ہلکا گلابی لباس بکھرا پڑا ہے جسے اس کی ملازمہ سانولی تہہ کر رہی ہے۔

ساحرہ: ربابوں کو ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے یہ کپڑے گودام میں میرے کائے سوٹ کیس میں رکھ آؤ سانولی۔ آئندہ سبز رنگ کے بغیر میرے اور کسی رنگ کے کپڑے نہ لگا لا کرو۔

سانولی: کیوں بیگم صاحب جی!

ساحرہ: (چہرے پر ناخوش گوار سے تاثرات ہیں) بس۔

سانولی: رپلٹ کر ساحرہ کو دیکھتے ہوئے مجھے تو یہ سوٹ پسند آیا تھا بیگم صاحب جی۔ کتنا پیارا رنگ ہے۔ اس ساڑھی سے تو یہ سوٹ پہن لیتیں۔ صاحب جی آپہ ہیں۔ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے۔

ساحرہ: صاحب جی اس سوٹ کو دیکھ دیکھ کر باغ باغ نہیں ہوتے۔

سانولی: کیوں جی — کیا پھبتا یہ رنگ آپ کے چہرے پر۔

ساحرہ: اودہ — سانولی — اتنے دن ہو گئے یہاں آئے ہوئے، تجھے ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ صاحب بہادر کو سوائے رنگ کے دنیا کا اور کوئی رنگ پسند ہی نہیں۔  
سانولی: (مسکرا کر) ہائے اللہ۔ میں بھی کہوں — گھر کی ہر چیز سبز رنگ کی

کیوں ہے۔

ساحرہ: یہ ہمارے صاحب بہادر کی والہانہ پسند ہے۔

سانولی: کمروں کی چیزیں تو سبز رنگ کی اچھی لگتی ہیں۔ لیکن آپ کا لباس صبح و شام ایک ہی رنگ کا — جتنا نہیں بیگم صاحب جی — دل تنگ نہیں آتا آپ کا۔  
ساحرہ: (گہری آہ بھر کر) دل تنگ آنے کا ہمتی ہو — (جھلا کر) مجھے تو صبح و شام یہ رنگ استعمال کر کر کے اس سے شدید نفرت ہو گئی ہے۔ پکڑے سبز، کمرے سبز، بستر سبز — کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جس میں یہ واہیات رنگ نمایاں نہ ہو۔  
سانولی: صاحب جی کو اتنا پسند ہے یہ رنگ۔

ساحرہ: پسند؟ انہیں تو عشق ہے اس رنگ سے۔ سال ہونے کو آیا میری شادی کو۔ ہر طرف سبز ہی سبز رنگ دیکھتے طبیعت اکتا چکی۔ لیکن وہ ہیں کہ والہانہ پن میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

سانولی: جب تیرے کپڑے تو سبز رنگ کے نہیں تھے آپ کے۔

ساحرہ: اسی لیے تو دیے کے دیے پڑے ہیں۔ کتنے چاؤ سے بنوائے تھے میں نے اپنے لباس — یہ (گھلائی کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے) رنگ تو میرا دل پسند رنگ تھا۔ لیکن اب تو اسے صرف اماں کے گھر جاؤں تو پہن سکتی ہوں — وہ بھی جب اکیلے جاؤں۔

سانولی: ویلے سبز رنگ آپ پر کھلتا خوب ہے بیگم صاحب جی۔

ساحرہ: رہتے دے سانولی۔ جہنم گیا رنگ کا کھلنا — مجھے تو اس رنگ کو دیکھ

کر متلی آنے لگتی ہے۔

سانولی: صاحب جی سے کہہ دیں۔ نہ پہنا کریں۔

ساحرہ: اودہ — تو نہیں سمجھ سکتی سانولی — میری مجبوری کو — جی تو میرا بھی چاہتا ہے۔ نہ پہنا کروں یہ رنگ — لیکن صاحب بڑے نازک مزاج ہیں۔ ان کی پسند کا احترام ہے۔ ورنہ —  
سانولی: بڑی ہمت ہے آپ کی۔

ساحرہ: (ہنس کر) یہ ہمت کسی دن اچانک جواب دے جائے گی۔ اب تو اس رنگ کو برداشت کرنا شکل لگتا ہے۔

سانولی: چلو — کیا ہوا بیگم صاحب بھی — صاحب جی کو پسند ہے۔ بیوی شوہر کی پسند کا کھائے پہنے تو اچھا ہوتا ہے۔

ساحرہ: (گہری آہ بھر کر) اچھا سانولی — اب تم تہہ کر بھی ڈالو ان کپڑوں کو — (گھڑی دیکھ کر) جہاز کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ سانولی جلدی کرو۔ ڈرائیور سے کہہ گاڑی نکالے۔

سانولی: (رکپڑے اٹھاتے ہوئے) دس بجے کے جہاز سے آرہے ہیں صاحب۔  
ساحرہ: ہاں۔

سانولی: وقت ہو گیا ہے۔

ساحرہ: ہاں — جلدی جاؤ — ڈرائیور کو دیکھو۔ یہیں ہے نا —

(سانولی بہت اچھا کہہ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ ساحرہ آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیتی ہے۔)

ساحرہ: (اپنے آپ سے) سبز ساڑھیاں۔ سبز غرارے۔ سبز پاجامے کڑتی۔ سبز شلوار قبض — آف (سر پکڑ لیتی ہے) حد ہو گئی جنون کی کتنی اکتا ہٹ ہوتی ہے اس رنگ سے — (ادھر ادھر دیکھ کر) سارا گھر سبز رنگ میں ڈوبا ہوتا ہے۔ گھر شہو مزار ہو گیا۔ ہونہ کب تک جبر کروں گی اپنے آپ پر۔ میری پسند تو

جیسے کچھ ہے ہی نہیں۔ زبردستی مسلط کیے جاتے ہیں اپنی پسند مجھ پر — دھڑے پر  
ناخوشگوار تاثرات بڑے واضح نظر آنے لگتے ہیں — انسان ہوں میں بھی۔ پتھر تو  
نہیں — بڑے آئے — ہوئے —

(سالولی اندر آتی ہے)

سالولی: بیگم صاحب جی گاڑی نکال دی ڈرائیور نے۔

ساحرہ: (بھلایا ہوا پریشان چہرہ) بہت اچھا آتی ہوں ابھی —

(سالولی اس کا منہ دیکھنے لگتی ہے۔ ساحرہ اپنا بزنسنگ کا پرس اٹھاتی ہے  
اور کمرے سے باہر نکل جاتی ہے)۔

— ... —

ڈرائنگ روم۔ آرامتہ وپراستہ۔ لیکن ہر چیز بزنسنگ کے کسی نہ کسی شیڈ میں ہے۔  
ہلکے بزنسنگ کے فوم کے صوفے پر گہرے بزنسنگ کے کپڑے پہنے ساحرہ بیٹھی ہے۔  
قریب ہی براؤن سوٹ میں ملبوس نسیم بیٹھا ہے۔ خوش رُو صحت مند اور خوش مزاج  
نوجوان ہے۔ ساحرہ کے سامنے ٹالی پر چائے کا سامان رکھا ہے۔ ساحرہ چائے  
بنا رہی ہے۔ نسیم محبت بھری نظروں سے ساحرہ کو دیکھ رہا ہے۔

ساحرہ: (ادائے ناز سے) کیا مکملی باندھے دیکھے جا رہے ہیں۔

نسیم: خدا قسم بزنسنگ میں گھرا گلاب کا پھول لگ رہی ہو۔

ساحرہ: (ساحرہ خوش ہونے کی بجائے کچھ بھنپلا جاتی ہے) چائے لیجئے۔

نسیم: شام ہوائی اڈے پر بزنس سائرس میں تمہیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ تمہیں

میری پسند کا کتنا احترام ہے۔

ساحرہ: پہلے کیا کم بزنسنگ کی ساڑھیاں ہیں میرے پاس۔ جو ایک اور اٹھالائے۔

نسیم: (دشائستگی سے) لیکن اس میں غصہ میں آجانے کی کیا بات ہے؟

ساحرہ: تو کیا خوشیاں مناؤں۔

نسیم: ساحرہ — تم ساڑھی کا کپڑا تو دیکھو۔ کتنی نفیس چیز ہے۔

ساحرہ: جہنم میں جاتے نفیس چیز — (غصے سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے)  
رنگ آگنی ہوں میں اس رنگ سے۔

نسیم: ساحرہ! —

ساحرہ: (غصے سے جُزبہز ہوتے ہوئے) نہیں چاہیے مجھے یہ ساڑھی۔ بزنرنگ۔  
بزنرنگ — بزنرنگ — (سرکپڑ لیتی ہے) آف!

نسیم: (دشوق اور چاہت مجروح ہوتے ہیں) انہیں ہو کیا رہا ہے۔

ساحرہ: (دیوانگی کے سے انداز میں) نہیں چاہیے مجھے یہ ساڑھی۔ آپ مجھے انسان نہیں سمجھتے۔ اپنی پسندیدوں ٹھونے جاتے ہیں جیسے میں پتھر ہوں۔ ہر طرف بزنر ہی بزنر رنگ دیکھتے دل خراب ہونے لگتا ہے۔ پہلے کیا کم تھے۔ اس رنگ کے کپڑے جو یہ اور اٹھالائے ہیں۔ نہیں پہنوں گی نہیں پہنوں گی — (سرکپڑ لیتی ہے) میں یہ ساڑھی نہیں پہنوں گی۔

نسیم: (رہرہاں اسے دیکھتا ہے) ساحرہ — تمہیں ساڑھی پسند نہیں کم از کم میرے شوق اور جذبے کا ہی خیال رکھا ہوتا — کتنے ارمان سے خریدی ہے میں نے یہ ساڑھی۔

ساحرہ: بس نہیں پہنوں گی — نہیں پہنوں گی۔ پسند کو وبال جان بنا رکھا ہے۔  
آپ نے — عذاب میں جان آگئی ہے۔

نسیم: (غصے میں آکر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) اتنے عذاب میں تمہیں۔ تو پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔  
ساحرہ: (اس کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر) حد بھی ہوتی ہے کس بات کی۔  
(غصے سے ساڑھی اٹھا کر دیکھتی ہے۔ پھر نسیم کی طرف پھینک دیتی ہے)

نسیم: (ٹھوکر مار کر ساڑھی کو تالین پر بکھیر دیتا ہے) — دیا سلائی دکھا دو اسے۔  
(غصے میں تیزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

ساحرہ: میری تو جیسے پسند ہے ہی نہیں۔ مزاج ہی بگڑ گیا — بگڑا ہے۔  
میں بھی اب کبھی یہ رنگ نہیں پہنوں گی — نہیں پہنوں گی —

(راٹھ کر ساڑھی کو پیٹ کر صوفے پر دے مارتی ہے) اور خوش جذبات سے آنسو بہانے لگتی ہے)

(دوسری ڈرائنگ روم۔ ساڑھی صوفے پر پھیلی پڑی ہے۔ سپر ہرڈ صل رہی ہے۔  
ساحرہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹھل رہی ہے۔ آنکھیں متورم ہیں۔ صبح والے بزنر لباس میں ہے۔ لیکن چہرہ اداس اور دیران ہے)

ساحرہ: (صوفے پر گرتے ہوئے) سانولی — اے سانولی۔

سانولی کی آواز: جی بیگم صاحب جی۔

ساحرہ: بات سن۔

(سانولی ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے اندر داخل ہوتی ہے)  
سانولی: جی۔

ساحرہ: صاحب نہیں ابھی تنگ۔

سانولی: جی نہیں۔

ساحرہ: پتہ نہیں کہاں گئے۔ کھانا کھانے بھی نہیں آئے۔

سانولی: آپ تو کھا لیتیں بیگم صاحب جی۔ اب تو چار بجنے والے ہیں۔

ساحرہ: (سرفہ کے انداز میں ہلاتی ہے)

سانولی: صاحب کو کوئی ضروری کام پڑ گیا ہوگا۔ دس دن باہر رہے ہیں۔ کام

کی دیکھ حال میں لگے ہوں گے۔ آپ کھانا کھالیں (دراچپ ہ کر) لگا دوں کھانا۔

ساحرہ: (گھبراہٹ اور پریشانی سے) نہیں — جب تک نسیم نہیں آئیں گے۔

آنکھیں بھی سوچی ہوئی ہیں — اب تم کچھ بتانا نہ چاہو تو دوسری بات ہے۔

ساحرہ: اسماء سچ کہتی ہوں۔ بات کچھ بھی نہیں —

اسماء: نسیم سے لڑائی ہوگئی ہوگی۔

ساحرہ: سر جھکا کر بس —

اسماء: بس کیا۔ ابھی اپنی نوکرائی سے تم نسیم ہی کے متعلق کہہ رہی ہوگی۔

ساحرہ: (مغموم مسکراہٹ) ہاں۔

اسماء: ہٹا کیا؟

ساحرہ: بہت معمولی سی بات۔

اسماء: پھر بھی۔

ساحرہ: رگہری آہ بھر کر، بس اس موٹے سبز رنگ کی وجہ سے لڑائی ہوگئی۔

اسماء: سبز رنگ نسیم کو پسند ہے۔

ساحرہ: دیوانگی کی حد تک۔

اسماء: پھر۔

ساحرہ: جتنا انہیں پسند ہے — اتنا ہی مجھے اس رنگ سے چڑھتی جا رہی

ہے۔ (آنکھوں میں آنسو بھرا آتے ہیں) احد بھی تو ہوتی ہے اسماء۔ سال بھر ہو رہا ہے

شادی کو — صبح و شام یہی مردار رنگ دیکھتے آنکھیں دکھ گئی ہیں، گھر کی ہر چیز

سبز — میرا ہر لباس سبز — اس پر کل کراچی سے یہ نئی سبز ساڑھی اٹھا لائے —

بس مجھے تو دیکھ کر آگ ہی لگ گئی۔

اسماء: آگ لگنے کی بات تو کوئی نہیں۔

ساحرہ: یہ تم کہتی ہو نا — میری جگہ ہو تیں تو دل پھٹ جاتا۔

اسماء: اوہو — اتنا ہی تنگ آگئی ہو۔

ساحرہ: بس آج تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہی ہو گیا۔

اسماء: (بیرنگی سے) اتنی سی بات پر لڑ پڑیں نسیم سے۔

میں نہیں کھاؤں گی۔

سانولی: وہ تو اب رات ہی کو آئیں گے۔ دفتر میں کام —

ساحرہ: وہ دفتر میں نہیں ہیں۔ میں دو تین بار ٹیلی فون کر چکی ہوں۔

سانولی: ہوٹل گئے ہوں گے۔

ساحرہ: نہیں، سانولی نہیں — وہ — وہ — صبح ناراض ہو — کر گئے ہیں۔

سانولی کے پوچھنے سے پہلے ہی ساحرہ کی عزیز ترین سہیلی اسماء اندر داخل

ہوتی ہے)

اسماء: (مسکراتے ہوئے) کون ناراض ہو کر گیا۔

ساحرہ: اوہ تم — اسماء آؤ — لاٹھ کر استقبال کرتی ہے — (بڑے

دونوں بعد آئیں۔

اسماء: تمہاری طرح بیکار کی روٹیاں تھوڑا ہی توڑتی ہوں۔ ایک عدد شوہر اور

دو عدد بچوں کو بھی سنبھالنا ہوتا ہے۔

(دونوں صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں)

ساحرہ: (اسانولی سے) جاؤ چائے تیار کرو۔

سانولی: اچھا بیگم صاحب جی (چلی جاتی ہے)

اسماء: (سانولی کی طرف اشارہ کر کے) یہ رنگ روٹ —

ساحرہ: (مسکراتے کی کوشش میں) امی نے بھجوا دی ہے۔ بڑا کام کرتی ہے۔

اسماء: یہ خیر سے آنکھیں کیوں لال انگارہ ہو رہی ہیں۔ رو رہی تھیں۔

ساحرہ: (رجھک کر) نہیں — نہیں — تو۔

اسماء: بکو نہیں — کیا ہوا؟

ساحرہ: کچھ بھی تو نہیں — (سر جھکا کر انگلی پر آنچل لپیٹتے ہوئے افسردہ

ہو جاتی ہے۔)

اسماء: کچھ تو ہے — آخر ایسی بھی پردہ داری کیا — پریشان نظر آرہی ہو۔



اسماء: اس کا حل سوچنا چاہیے۔ لڑائی تو اس کا حل نہیں۔  
 ساحرہ: تم ہی کچھ بتاؤ۔ میرا تو دماغ پھٹ جائے گا۔  
 اسماء: ہوں.....

دسانولی چائے لے کر آ جاتی ہے۔ ٹرائی پر رکھی چائے والی پر  
 سبز رنگ کی ٹی کوڑی اور سبز پھولوں والی پیالیاں رکھی ہیں۔  
 ساحرہ سوچ میں ڈوبی ہے۔ سانولی ٹرائی سامنے رکھ کر  
 چلی جاتی ہے،  
 اسماء: میں نے تنھاری الجھن کا ایک حل سوچ لیا۔  
 ساحرہ: کیا؟

اسماء: کان میں بتاؤں گی۔  
 ساحرہ: اس کی طرف جھک کر بتاؤ۔  
 اسماء: اس کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ ساحرہ  
 کے چہرے کے کنارے چڑھاؤ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی  
 باتیں دلچسپ ہیں۔

اسماء: کیوں؟ کیا خیال ہے؟  
 ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) خیال اچھا ہے۔  
 اسماء: بس پھر عمل شروع کر دو۔ آج ہی سے۔  
 ساحرہ: لیکن وہ آتولیں۔ صبح سے غائب ہیں۔  
 اسماء: آخر تو آئیں گے ہی۔

ساحرہ: یہ بھی کر دیکھتی ہوں۔ لیکن نتیجہ۔  
 اسماء: ربات کاٹ کر (غاطر خواہ لکھے گا۔  
 ساحرہ: کیا معلوم؟

ساحرہ: یہ اتنی سی بات ہے؛  
 اسماء: ایسی سنجیدہ بھی نہیں۔ شوہر کی پسند کا احترام اچھی بیوی کا فرض ہے۔  
 ساحرہ: ہونہ۔

اسماء: اور خاص کر نسیم جیسے شوہر کی پسند کا احترام۔  
 ساحرہ: لیکن۔

اسماء: لیکن کیا؟ تمہیں نسیم جیسا شوہر ملا ہے ساحرہ۔ تمہیں تو اپنی خوش بختی  
 پر تاناؤ ہونا چاہیے۔ تمہارے آرام و آسائش کا جس طرح وہ خیال رکھتا ہے۔ بہت  
 کم آدمی ایسے ہوتے ہیں۔

ساحرہ: کچھ کتراتے ہوئے، میں کب الٹا کر کرتی ہوں۔  
 اسماء: پھر اتنی سی بات پر اس کی دل شکنی کیوں کی؟  
 ساحرہ: پھر وہی اتنی سی بات۔ میرے جذبات کو بھی تو دیکھو۔ دل تنگ  
 نہیں آ جاتا کیا؟

اسماء: دل تنگ آ جانے کا یہ مطلب تو نہیں۔ کہ تم پنجے بھاڑ کر شوہر کے  
 پیچھے ہی پڑ جاؤ۔ کس خواہش اور چاہت سے وہ بیچارہ یہ ساڑھی لایا ہوگا۔ تم نے  
 اس کا دل توڑ دیا۔

ساحرہ: کچھ کٹتے پھٹے، اس وقت خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اب  
 افسوس ہو رہا ہے۔ مجھے ان سے اس طرح پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ۔  
 آج۔ کھانا۔ کھانے بھی گھر نہیں آئے۔

اسماء: ذرا دماغ شریف سے کام لے لیا کرو تا۔ ایک دم جذباتی ہو جاتی  
 ہو۔ ذرا سی بات پر شوہر کو ناراض کر دیا۔ اس کی دل شکنی کر دی۔

ساحرہ: تو۔ میں کیا کرتی۔ تمہیں کہہ چکی نا۔ مجھے اس سبز رنگ  
 سے چلو ہو گئی ہے۔ بدواشت نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ ہیں کہ بس اس رنگ کے  
 سو کوئی رنگ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

اسماء: مجھے یقین ہے۔  
 ساحرہ: خدا کرے ایسا ہی ہو۔  
 اسماء: ضرور ہوگا۔ اچھا بھی چائے بناؤ۔ باتیں چائے  
 کے ساتھ بھی ہو سکتی ہیں۔  
 (ساحرہ مسکراتے ہوئے چائے بنانے لگتی ہے)

ادھی خواب گاہ، ساحرہ نے صبح والی ساڑھی پہن رکھی ہے جو نسیم کراچی سے لایا  
 تھا۔ آرائش و زیبائش بھی خوب کی ہے۔ کالوں میں سبز موتیوں والے آویزے بھی پہن  
 رکھے ہیں۔ بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی وہ سبز رنگ کی اون سے سلاٹیاں بن رہی ہے۔  
 نسیم ناراضگی کا انداز لیے کوٹ اتار کر ہینگر میں لٹکا رہا ہے۔ منہ پھلاٹے روٹھا روٹھا سا  
 نظر آتا ہے ساحرہ ایک ادائے دلربائی سے اسے دیکھ کر مسکراتی ہے۔ لیکن وہ اس  
 کی جانب دیکھتا تک نہیں۔ ساحرہ سلاٹیاں میز پر رکھ کر مہین ساڑھی کا پلو درست  
 کرتے اس کے قریب آتی ہے۔ برقی روشنی میں اس کا حسن بیشمال نظر آتا ہے۔ نسیم  
 منہ دوسری طرف پھیر کر ٹائی کی گرہ کھوتا ہے)  
 ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) آج اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ دس بج

رہے ہیں۔

نسیم کوئی جواب نہیں دیتا۔ ساحرہ مسکراتے ہوئے اس  
 کے سامنے آ جاتی ہے۔

ساحرہ: نسیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہاں رہے  
 سارا دن۔

نسیم: (خفگی سے) تمہیں کیا۔۔۔  
 ساحرہ: مجھے کیوں نہیں؟ سارا دن انتظار کرتی رہی۔ دوپہر کھانے کیلئے

نہیں آئے گی۔

نسیم: (طنز یہ انداز میں) میں اپنی پسند تم پر ٹھونسا نہیں چاہتا — تم انسان ہو پتھر تو نہیں۔

ساحرہ: ہائے اللہ آپ نے تو بات ہی پکڑ لی میری — جانے کیوں غصہ آگیا تھا

اس وقت —

نسیم: خدا جانے کب سے دبائے بیٹھی تھیں غصہ — پہلے بتا دیا ہوتا۔ تو میں محتاط ہو جاتا۔

ساحرہ: دیکھئے میں معافی مانگ رہی ہوں — آپ بھی غصہ جانے دیجئے۔

نسیم: (ٹٹائی ہاتھ میں پکڑ کر افسردگی سے) ساحرہ — تم نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔

ساحرہ: (پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے) اب جانے بھی دیجئے نا — میں خود ہی نادام ہوں۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا نسیم — آپ کی پسند مجھے محبوب ہوگی۔ اب تو مسکرا دیجئے۔

نسیم: (اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر) کبھی کبھی خدا جانے تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔

ساحرہ: (اس کے سینے سے سر لگا کر) اب کبھی کچھ نہیں ہوگا۔

نسیم: (اسے بازوؤں میں لے لیتا ہے) ساحرہ۔

ساحرہ: نسیم۔

(چند لمبے دونوں بے سدھ سے کھڑے رہتے ہیں۔ باہر سے قدروں

کی چاب سنائی دیتی ہے۔ ساحرہ اور نسیم مسکراتے ہوئے الگ ہو جاتے

ہیں۔ سافولی اندر آتی ہے)

سافولی: کھانا لگا دوں بیگم صاحب جی۔

ساحرہ: ہاں۔

بھی نہ آئے۔

نسیم: (روٹھے روٹھے لہجے میں) نہیں آیا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔

ساحرہ: (آنکھوں کو شوخی سے نچاتے ہوئے) اس کی ٹٹائی پکڑ لیتی ہے (خفا

ہیں ابھی تک۔

نسیم: (جھٹکے سے ٹٹائی چھڑا کر) خفگی کس بات کی۔

ساحرہ: اللہ اللہ — ایسا غصہ۔

نسیم: مجھے کپڑے بدلنے دو۔

ساحرہ: کھانا نہیں کھائیں گے۔

نسیم: نہیں!

ساحرہ: کھا آئے۔

نسیم: مجھے کپڑے تبدیل کرنا ہیں۔

ساحرہ: میں کھانے کا پوچھ رہی ہوں۔

نسیم: مجھے نہیں کھانا — کھانا — (غصے سے) ادنیٰ سنتی ہو گیا۔

ساحرہ: (اس کے کندھے سے سر لگا دیتی ہے) آپ صبح والی بات پر ناراضی

ہیں نا۔

نسیم: نہیں — (آواز میں غصے کی جھلک ہے) ناراضگی کی کیا بات تھی۔

ساحرہ: معاف کر دیں۔

نسیم: کوئی بات بھی ہو۔

ساحرہ: دیکھئے، غصہ تھوک دیجئے — میں اپنے رویے پر نادام ہوں۔

نسیم: (چند لمبے ساکت نظروں سے ساحرہ کو دیکھتا ہے — ساحرہ

مسکراتے لگتی ہے — نسیم کے چہرے پر اب خفگی کی بجائے افسردگی کے تاثرات

ہیں —) ساحرہ —

ساحرہ: (نادام ہو کر) معاف کر دیں نا — آئندہ کبھی اس بات کی نوبت

ساتولی: بہت اچھا رچلی جاتی ہے۔  
 ساحرہ: میری آنتیں تو قتل ہو اٹھ پڑھ رہی ہیں۔ بڑے وہ ہیں آپ۔  
 خود تو دوپہر بھی کھانا کھالیا ہوگا۔ میں صبح سے بھوک بیٹھی ہوں۔  
 نسیم: (مسکراتے ہوئے) خاک کھالیا تھا۔ قسم لے لو جو ایک کھیل بھی منہ میں  
 گئی ہو۔ میری آنتیں تمہیں دعائیں دے رہی ہیں۔ بے ایمان کہیں کی۔ سارا  
 دن برباد کر دیا میرا۔ اتنا پریشان کیا۔

ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) خود کیا کم پریشان رہی ہوں۔  
 (دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگتے ہیں)

(وہی خواب گاہ۔ دوپہر کا وقت ہے۔ نسیم دفتر سے آتا ہے۔  
 بیگ ایک میز پر رکھ کر الماری میں اپنے گھر کے کپڑے دیکھتا ہے۔ لیکن  
 الٹ پلٹ کرنے سے باوجود کپڑے نہیں ملتے۔ الماری کا پیٹ  
 کھلا پھوڑ کر وہ کھڑکی کے قریب آکر ساحرہ کو آواز دیتا ہے،  
 نسیم: ساحرہ۔

ساحرہ کی آواز آتی ہے: جی۔

نسیم: بھئی! میرے کپڑے کہاں ہیں۔

آواز: جی! الماری ہی میں ہیں۔

نسیم: مجھے نہیں مل رہے۔

آواز: ابھی آئی۔

نسیم ادھر ادھر ٹہلنے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد ساحرہ اندر آتی ہے۔

سبز رنگ کا لباس پہنے ہے۔ چہرے پر جان واری بشارت ہے۔

آنکھوں میں شوخ سی چمک ہے۔

نسیم: میرے کپڑے کہاں ہیں!۔

ساحرہ: الماری میں۔

نسیم: میں تو دو تین بار دیکھ چکا ہوں ہی نہیں۔

سے اپنا لیا ہے۔ اب مجھے اس سبز رنگ سے بالکل دیے ہی محبت ہے جیسے آپ سے۔  
 اب آپ کو یہ کپڑے پہننا ہی پڑیں گے۔  
 نسیم: (غصیلے لہجے میں) ساحرہ۔  
 ساحرہ: (اطمینان سے) جی! —  
 نسیم: دوسرے کپڑے نکالو۔ یہ کیا مذاق ہے۔  
 ساحرہ: یہ مذاق نہیں نسیم۔  
 نسیم: (جھلا کر) خدایا۔

(ساحرہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔)

نسیم: میں یہ کپڑے نہیں پہنوں گا۔ نہیں پہن سکتا۔ دوسرے نکالو۔  
 ساحرہ: (ادائے ناز سے) آپ ضرور پہنیں گے۔ دوسرے کپڑے اب نہیں ملیں گے۔  
 یہن کر دیکھئے تو سہی۔ (نسیم جھلا جاتا ہے۔ ساحرہ محبت سے اسے دیکھنے لگتی ہے۔)  
 ساحرہ: میں سال بھر سے آپ کی پسند کے کپڑے پہن رہی ہوں۔ اس رنگ  
 سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن کل کی لڑائی سے میں نے یہی سبق سیکھا ہے کہ اس رنگ  
 کو دل و جان سے قبول کر لوں۔ آپ کی پسند میری پسند ہے اب۔

نسیم: کیا فضول باتیں کر رہی ہو جھلا کر! یہ رنگ مردوں کے پہننے کا ہے؟  
 ساحرہ: کوئی رنگ بھی کسی کے لئے مخصوص نہیں ہوتا۔ پسند کی بات ہے  
 بس۔ میرا دل نہ توڑیئے۔ پہن لیجئے نا۔ آپ تو اتنے اچھے ہیں۔ (نسیم کے گلے  
 میں بائیں ڈال کر لہرا جاتی ہے)

نسیم: (شش و پنج میں) حد ہو گئی۔

ساحرہ: نسیم۔ پہن لو نا۔ دیکھو تو کتنا کھلتا ہوا رنگ ہے۔  
 (نسیم کپڑے اٹھا کر سر ہلاتے ہوئے پریشان پریشان سا ساتھ والے کمرے  
 میں چلا جاتا ہے۔ ساحرہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اُبل پڑنے والی ہنسی کو روک لیتی  
 ہے۔)

ساحرہ: کون سے کپڑے تلاش کر رہے ہیں۔  
 نسیم: بھی گھر پہننے کے۔ شلواری قمیض۔  
 ساحرہ: الماری ہی میں تو ہنگے ہیں۔  
 نسیم: نکال دو تم ہی۔ (نسیم بوٹوں کے تسمے کھولنے لگتا ہے۔ ساحرہ  
 الماری کی طرف جاتی ہے۔ کھونٹی سے شلواری قمیض اتارتی ہے۔ اور نسیم کی طرف بڑھا  
 دیتی ہے۔)  
 نسیم: گہرے سبز رنگ کی شلواری اور قمیض کو متعجب ہو کر دیکھتا ہے) میں اپنے  
 کپڑے مانگ رہا ہوں۔

ساحرہ: (دوسروں کی سنجیدگی سے) آپ ہی کے تو ہیں۔  
 نسیم: یہ میرے کپڑے ہیں۔  
 ساحرہ: (قمیض پھیلا کر دکھاتی ہے) آپ کی ہی تو ہے قمیض یہ شلواری بھی۔  
 نسیم: (حیران ہو کر) لیکن یہ سبز رنگ کے۔  
 ساحرہ: (اترا کر پیار سے) کتنا پیارا رنگ ہے۔ آپ پہنیں گے تو یوں لگے گا۔  
 جیسے سبز ہیز توں میں گلاب کا پھول کھلا ہے۔  
 نسیم: (اچنبھے سے) ساحرہ۔ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔  
 ساحرہ: کیوں؟ دیکھئے نا پھول مڑ کر ہوتا ہے۔ گلاب کا پھول دراصل مرد سے  
 مماثلت رکھتا ہے۔ آپ سبز کپڑے پہنیں گلاب کا پھول۔  
 نسیم: (جھلا کر) یہ کیا حماقت ہے۔

ساحرہ: کیوں جی؟

نسیم: میں اور یہ کپڑے۔

ساحرہ: ہرج کیا ہے۔

نسیم: ساحرہ۔

ساحرہ: دیکھئے، آپ حیل و حجت نہ کریں۔ میں نے آپ کی پسند کو دل و جان

ساحرہ: کیا ہرج ہے۔ پسند کا کوئی مول نہیں ہوتا۔  
 نسیم: (خیر جاتا ہے) جہنم میں گئی ایسی پسند۔  
 ساحرہ: (کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے) یہ آپ کہہ رہے ہیں۔  
 نسیم: تمہیں یہ سوجھی کیا ہے؟  
 ساحرہ: (سجدہ نظر آتی ہے) کیوں؟  
 نسیم: مجھے تو لگتا ہے۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔  
 ساحرہ: واہ جی۔

نسیم: تو اور کیا۔

ساحرہ: میں نہیں چاہتی کہ معمولی سی بات کے لئے ہماری ازدواجی زندگی  
 تلخ ہو جائے۔ اسی لیے میں نے اپنے آپ کو ذہنی اور دماغی طور سے اس رنگ  
 سے وابستہ کر لیا ہے۔

نسیم: لیکن — لیکن تم — زبردستی مجھے اس رنگ کے پہننے پر مجبور  
 کیوں کرتی ہو۔

ساحرہ: میاں بیوی میں زبردستی اور مجبوری کا تکلف کیسا۔ مجھے آپ کی پسند  
 عزیز ہے۔

نسیم: لیکن اس سے میرے کپڑوں کا کیا تعلق؟  
 ساحرہ: تعلق کیوں نہیں۔ جب گھر کی ہر چیز ہنز ہو سکتی ہے۔ گاڑی کا رنگ  
 ہنز ہو سکتا ہے۔ میرا ہر لباس ہنز ہو سکتا ہے۔ تو آپ کے کپڑے ہنز کیوں نہ ہوں۔  
 ہوا خیز ہنز ہے آپ کے رنگ برنگے کپڑے بڑے عجیب سے لگتے ہیں۔

نسیم: (کرسی پر بیٹھ کر سر کھڑکتا ہے) اوہ — تم — بس بھی کرو اب  
 مذاق ختم ہو گیا۔ میری سفید قمیض نکالو۔ (تولیہ دوسری کرسی پر پھینک دیتا ہے)  
 ساحرہ: سفید قمیض نہیں ہے۔

نسیم: (غصے میں آجاتا ہے) مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔ دس دن پہلے

نسیم نے ہنز شلوار قمیض پہن رکھی ہے۔ ہاتھ میں ہنز ہی رنگ کا تولیہ  
 ہے۔ غسل خانے سے وہ اپنے گیلے بالوں کو پونچھتا باہر آتا ہے۔ ساحرہ  
 الماری سے اس کے کپڑے نکال رہی ہے۔ ہنز بنیان اور بوسکی کی  
 ہنز قمیض کرسی کی پشت پر ڈال دیتی ہے۔  
 نسیم: (بنیان اور قمیض دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے) یہ — یہ کیا۔  
 ساحرہ: (مسکراتے ہوئے) یہ آپ کی بنیان — یہ قمیض۔  
 نسیم: (دھچکا کر غراتا ہے) یہ — ہنز بنیان — ہنز قمیض — تمہیں کیا  
 ہو گیا ہے — دماغ تو نہیں چل گیا۔  
 ساحرہ: (خوبصورتی سے ہنس کر) بالکل نہیں — صرف آپ کی پسند اپنائی  
 ہے — ہنز رنگ سے آپ کو داہانہ لگاؤ تھا۔ مجھے اب اس رنگ سے مجنونانہ عشق  
 ہو گیا ہے۔

نسیم: (کچھ سمجھ نہیں پاتا۔ کہ کیا کہے)۔ ساحرہ!  
 ساحرہ: (دھمور کن انداز میں اسے دیکھتی ہے۔ کتنا خوب صورت رنگ ہے۔  
 دیکھئے۔ قمیض اسے دکھاتی ہے۔)  
 نسیم: (بجدا مذاق ختم کر دے) یہ ہنز کپڑے پہنا کر پہلے ہی کارٹون بنا رکھا ہے مجھے۔  
 اب یہ ہنز قمیض پہن کر دفتر جاؤں گا؟

ساحرہ: (اک مسحور کن ادا سے اسے دیکھتے ہوئے) واقعی؟  
 نسیم: (کانٹن کو ہاتھ لگا کر) تو بہ میری جواب تم سے فرمائش کروں۔  
 ساحرہ: (تہقکہ لگاتی ہے) ایک دو کپڑے سبز دیکھے تو جناب تنگ آ گئے  
 میری ہمت بھی تو دیکھئے۔

نسیم: بس بابا۔ کہا نا معافی دے دو۔ چلو کلاو میری سپید قمیض۔  
 ساحرہ: (دہنتے ہوئے) سب رنگ کے پاس ہیں۔  
 نسیم: (ریار سے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے) جھوٹ بول رہی ہوتا۔ ایک  
 قمیض برباد کروادی ساری قمیضوں کا یہ حشر کیا تو یاد رکھنا۔

ساحرہ: ادنیٰ اللہ!  
 نسیم: بتاؤ کہاں ہیں قمیضیں (کلائی اور زور سے مروڑتا ہے)۔  
 ساحرہ: (دوہری ہوتے ہوئے چیختی ہے) بکس میں پڑی ہیں۔ صرف ایک  
 ہی رنگوائی تھی۔ ادنیٰ۔ ہاٹے۔ میری کلائی۔  
 نسیم: (اور زور سے مروڑتے ہوئے) بے ایمان کہیں کی۔ برباد کر  
 ڈالی میری قمیض۔

(ساحرہ زور زور سے چیخنے لگتی ہے۔ نسیم ہنستے ہنستے اسے بیڈ  
 پر دھکا دے کر گرا دیتا ہے۔)

ہی باہر رہا ہوں۔ سارا کاروبار چوٹ ہو رہا ہے۔  
 ساحرہ: میں کب روکتی ہوں۔ تیار ہو کر چل دیں۔  
 نسیم: کہاں رکھی ہیں میری سفید قمیضیں۔  
 ساحرہ: رنگناز کے پاس۔

نسیم: (دیخ کر) کیا؟  
 ساحرہ: میں نے سب سفید قمیضیں رنگنے کو دے دیں۔  
 نسیم: (دچکتا ہے) ساحرہ۔

ساحرہ: کیوں جی۔ برا فروختہ کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کی  
 پسند کا احترام کرتے ہوئے آپ کی پسند۔  
 نسیم: (اٹھ کر جھلاٹے ہوئے بچے ہیں) جہنم میں گئی پسند۔ کیوں برباد کروا  
 دیئے میرے کپڑے۔

ساحرہ: برباد کہاں کرواٹے ہیں، سبز رنگ کے رنگوائے ہیں۔  
 نسیم: (چیختے ہوئے) ساحرہ۔

ساحرہ: (اطمینان سے) حیرانگی کی بات ہے۔ سبز رنگ نہ ہوا ہوا ہوگا۔ آخر  
 میں بھی تو صبح شام پہنتی ہوں۔ آپ پہن لیں گے تو۔

نسیم: (ساحرہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی شوخی اور چہرے کی  
 مسکراہٹ سے بہت کچھ سمجھ جاتا ہے۔) کافی ذہین ہو۔

ساحرہ: (حیران ہو کر) جی؟  
 نسیم: سبز رنگ سے گلو خلاصی کروانے کا اچھا طریقہ نکالا۔

(ساحرہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے)

نسیم: (چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے  
 معافی مانگنے کے انداز میں کھڑا ہو کر) معافی دے دو بیگم صاحبہ۔ آئندہ جس رنگ کا  
 جی چاہے کپڑا پہنو۔ بخدا مجھ پر رحم کرو۔ میں ایسی پسند سے باز آیا۔

شاید: جی ہاں۔

سمیعہ: پھر اتنی دیر کیوں لگا دی — آدھ گھنٹہ ہو گیا مجھے یہاں آئے۔

شاید: آئندہ تمہیں زحمت اٹھانا نہ پڑے گی۔

سمیعہ: (اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر ہر اسان نظر آتی ہے) بڑے سنجیدہ نظر آ رہے ہو۔

شاید: مجھے سنجیدہ نظر آنا ہی چاہیئے۔

سمیعہ: کیوں؟

شاید: میں اب ایک ذمہ دار شوہر ہوں سمیعہ — مجھ پر میری بیوی کا پورا بھاری ہے۔

سمیعہ: شاہد!

شاہد: میں آج صرف یہی کہنے آیا ہوں۔ کہ آئندہ میرے اور تمہارے تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔

سمیعہ: بیوی کا بھوت اعصاب پر سوار ہو گیا۔

شاہد: بیوی کا بھوت نہیں۔ میرے فرائض میری راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

سمیعہ: تم نے عمر بھر ساتھ نباہنے کی قسمیں کھائی تھیں شاہد۔

شاہد: تم نے شادی سے انکار کر کے ان قسموں کی اہمیت گنوا دی۔

سمیعہ: شادی کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی حامی نہیں ہوں۔

شاہد: مجھے والدین کا حکم بجالانا پڑا۔

سمیعہ: میں جانتی ہوں۔ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ لیکن شادی اور چیز ہے محبت

اور — اس شادی کو ہمارے تعلقات میں رخنہ نہیں بننا چاہیئے۔

شاہد: یہی تمہاری غلطی ہے سمیعہ — میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

ماضی میں جو ہو چکا ہو چکا — اب میں اک شائستہ، شریف اور محبت

کرنے والی پیاری سی بیوی کا شوہر ہوں۔

سمیعہ: (ریخ پا ہو کر) ادھو — اتنے مرعوب ہو گئے بیوی سے۔

## اف بہ مرد

”سمیعہ تہذیب نو کا مرقع معلوم ہو رہی ہے۔ لباس میں عربیائی ہے۔

چہرے پر میک اپ کی تہیں ہیں۔ بال تراشیدہ ہیں۔ انداز ساختہ اور ادائیں

بے باک ہیں۔ وہ اس وقت غصے میں نظر آ رہی ہے۔ بار بار گھڑی دیکھتی

ہے۔ کبھی ہٹلنے لگتی ہے۔ کبھی بیچ پر بیٹھ جاتی ہے۔ باغ کے ایک

تنہا گوشے میں وہ شاہد کا انتظار کر رہی ہے۔

سمیعہ: (اپنے آپ سے) شادی کر کے مجھے بھول ہی گیا شاید — آج بھی نہ آیا تو

یاد رکھے گا — میرا نام بھی سمیعہ ہے — سارے وعدے بھلا دیئے

اس نے۔ ایک بات بھی تو یاد نہیں رکھی۔ میں اس سے نیٹ لوں گی۔

آؤ لے — سمیعہ بڑبڑاتی ہے۔ ہماری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

مڑ کر دیکھتی ہے۔ شاہد آ رہا ہے۔ شاہد خوبصورت لڑکا ہے۔ لباس

سفاکتہ اور پروقار نظر آتا ہے)

سمیعہ: (چھپنے کے انداز میں اس کی طرف بڑھتی ہے) تم — آہی گئے آخر میں تو

نا امید ہو چلی تھی۔ کہ آج بھی صرف انتظار کی زحمت دو گے۔ میرا پیغام

مل گیا تھا نا۔



شاہد: ہونا بھی چاہیئے — میری بیوی نے مجھے ایسا پُرسکون اور اطمینان بخش ماحول دیا ہے۔ کہ اب تم سے ملنے کا خیال بھی اس سے جرم کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنی پُر خلوص بیوی سے بددیانتی نہیں کر سکتا۔

سمیعہ: (غصے سے پیر پٹنتی ہے اور شیرنی کی طرح غزاقی ہے) یہ تم کہہ رہے ہو شاید — تمہاری شادی میں نے صرف اس شرط پر ہونے دی تھی۔ کہ میں او تم دونوں حسب معمول ایک دوسرے کے قریب رہیں گے۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔

شاہد: یہ میری نا تجربہ کاری تھی۔

سمیعہ: اب؟ اب؟

شاہد: یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔

سمیعہ: شاہد!!

شاہد: سمیعہ — میرے حالات اسی بات کے متقاضی ہیں —

سمیعہ: تم مجھے یوں پھوڑ دو گے۔

شاہد: تمہارے دوستوں —؟

سمیعہ: میں اوروں کی نہیں تمہاری بات کر رہی ہوں۔

شاہد: میں کہہ چکا نا — اپنی بیوی کو دھوکے میں رکھ کر میں بددیانتی کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا۔

سمیعہ: بیوی کا اتنا خیال ہے؟

شاہد: ہونا ہی چاہیئے۔

سمیعہ: تم نے مجھے وعدوں کے سہارے دیئے تھے۔

شاہد: میں نادم ہوں۔

سمیعہ: صرف نادم ہونے سے اپنا پیچھا چھڑا لو گے —؟ میں تمہیں چین لینے

نہیں دوں گی؟ سمجھے مجھے چھوڑ کر تم شکہ کی بانسری بجاؤ۔ یہ ممکن نہیں ہے۔

شاہد: تم چاہتی کیا ہو؟

سمیعہ: وہی جو شروع سے چاہتی آئی ہوں۔

شاہد: (غصے سے) یہ اب ناممکن ہے۔ میں اپنی پُرسکون ازدواجی زندگی کو برباد نہیں کر سکتا۔

سمیعہ: (غصے سے پھینکارتے ہوئے) یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔

شاہد: (مستحکم آواز میں) بالکل۔

سمیعہ: تو پھر میرا بھی آخری فیصلہ سن لو۔

شاہد: میں تیار ہوں۔

سمیعہ: (اس کی پُرسکون آواز سے چڑکر) میں تمہیں سکھ کا سانس نہیں لینے دوں گی۔

شاہد: رہنسی دیتا ہے، سمیعہ اتنے جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جلدی

سے تمہیں اپنی مجبوری بتا دی ہے۔ میرا تمہارا ساتھ اب ممکن نہیں تمہارے

لیے نئی نئی راہیں کھلی ہیں۔ تمہارے بے تکلف دوست موجود ہیں۔ پھر

میری راہ میں حائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

سمیعہ: تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے — تم نے شادی کے بعد بھی مجھ سے تعلقات

قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا؟

شاہد: یہ میری غلطی تھی۔ میں اس کے لیے نادم ہوں — شاید اتنی اچھی بیوی

نہ ملتی — تو میں سیدھی راہ سے بھٹک کر پھر تمہارے قدموں میں آگرتا

لیکن اب — اب نگہت جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے راہِ ستقیم سے

بھٹکنا ممکن نہیں — ماضی گزر گیا — اسے میں بھی بھلا دینا چاہتا ہوں

تم بھی بھلا دو — مجھے ایک چھوٹی سی جنت میسر آگئی ہے — مجھے —

سمیعہ: (بات کاٹ کر غصے سے) میں تمہاری اس جنت میں آگ لگا دوں گی —

شاہد: (گھبرا کر) سمیعہ۔

سمیعہ: (قدم اٹھا کر چل دیتی ہے۔ جاتے جاتے دھمک کے انداز میں) تم جس زندگی

پر اتنا اترا رہے ہو میں اس میں تلخیوں کا زہر گھول دوں گی — میں تمہاری

بیوی کو سب کچھ بتا کر اسے تم سے اس طرح بدظن کر دوں گی کہ تم پارسائی کا  
لبادہ اوڑھنے کے باوجود ننگے نظر آؤ گے۔ تم بھول رہے ہو۔ عورت جب  
انتقام کی آگ بن جائے۔ تو سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے۔  
(تیز آواز میں) سمیو۔

(چل دیتی ہے) ہونٹ۔

رشا ہر ایک کو اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ آگ برساتی  
پھنکارتی، پیر پختی وہاں سے چل جاتی ہے)

— :: —

رسلیقہ اور نفاست سے آراستہ ڈرائنگ روم۔ شاہد مضطربانہ ٹہل  
رہا ہے۔ کبھی رک کر کچھ سوچنے لگتا ہے۔ کبھی دیوار کے ساتھ لگی  
خوبصورت پینٹنگ کو دیکھنے لگتا ہے۔ کبھی صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی  
عالم اضطراب میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

شاہد: (اپنے آپ سے) سمیو جیسی لڑکی سے یہ بات بعید بھی تو نہیں۔ لیکن۔  
لیکن مجھے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ نگہت کو اس  
نے بدظن کر دیا۔ تو کیا ہوگا۔ (سر ہٹام کر) آف۔ کتنی پُر سکون  
دینا ہے میری۔ سب تہہ دبالا ہو جائے گی۔ میری یہ چھوٹی سی جنت  
آگ سے راکھ بن جائے گی۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔  
نگہت کا ذہن مسموم نہیں ہونا چاہیئے۔ میں بے راہ رو تھا۔ سمیو  
مے میں نے تعلقات بڑھائے تھے۔ اخلاقی حد بندیوں سے بھی تجاوز کیا  
تھا۔ لیکن اب تو میں تائب ہوں۔ مجھے نگہت کے سوا کسی کی ضرورت نہیں۔  
سمیو لیکن سمیو۔ جیسی لڑکی۔ آف۔ اس نے انتقام لیا۔ تو۔  
(سر جھٹک کر سوچنے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد سر اٹھاتا ہے) کیوں نہ میں سب  
کچھ خود ہی نگہت سے کہہ دوں۔ اپنی لغزشوں کا اظہار خود ہی کیوں نہ  
کر دوں۔ یہ کانٹے خود ہی کیوں نہ نکال دوں۔ جو ہماری پُربہ راز دواہی

زندگی کے سینے میں چبھ کر لہو لہان کر دیں گے۔ نگہت کو یقیناً دھچکا لگے گا۔ لیکن وہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ مزاج میں انکسار ہے۔ حلیم الطبع ہے۔ صلح جو ہے۔ وہ یقیناً مجھے معاف کر دے گی۔ ہاں سمیڈ کے آگ لگانے سے پہلے ہی مجھے نگہت کو ہر بات بتا دینی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ میں اسے آگاہ کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر لوں گا۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ، کوئی راز۔ کوئی بعید نہیں رہنا چاہیے۔ یہی شرافت کا تقاضا ہے۔ محبت کا اصول ہے۔ لکڑے میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے وہ اپنا آخری فیصلہ بار بار دہراتا ہے)

.....

دوہی ڈرائنگ روم۔ شاہد صوفے پر بیٹھا ہے۔ اس کے پہلو میں نگہت بیٹھی ہے۔ نگہت شاہد کا سویٹر مٹن رہی ہے۔ شاہد بار بار اس کی طرف دیکھتا ہے۔ لب کھولنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر جیسے ہمت جواب دے جاتی ہے۔ وہ پریشان سا ہو جاتا ہے۔ نگہت اس کی حالت سے بے خبر نہیں۔

نگہت: (مسکرا کر) کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ شاہد: ادھ۔ نہیں تو۔ بات۔ دراصل یہ ہے کہ نگہت: کیبیے ناچپ کیوں ہو گئے۔ شاہد: (حالت قابل رحم ہے) نگہت:۔ نگہت: جی۔

شاہد: کچھ نہیں۔ میرا مطلب ہے۔

نگہت: ہائے اللہ آپ نے تو پریشان کر دیا۔ کیا بات ہے۔ بتا دیجئے نا۔ شاہد: (نگہت کا ہاتھ تھام کر) تم۔ بہت اچھی ہو نگہت۔ تم نے میری زندگی کو فردوسی رعنائیاں بخش دی ہیں۔ کتنا پرسکون اور اطمینان بخش ماحول ہے میرے گھر کا۔

نگہت: (مسکرا کر) تمہیں بہت لمبی ہو گئی ہے صاحب۔

شاہد: شادی سے پہلے میں ایک لڑکی کے دام فریب میں الجھ گیا تھا۔

نگہت: رہا تھ سے سلائیال، گر جاتی ہیں، جی!

شاہد: میں اعتراف گناہ کر کے تم سے معافی کا خواست گار ہوں۔ میں نہیں چاہتا

تھا کہ کسی وقت تمہیں میرے ماضی کے اس واقعے کا علم ہو کر ذہنی دھچکا

لگے۔ اور تم مجھے بددیانت اور بے ایمان سمجھنے لگو۔ میں نے یہی سوچا

کہ اپنی معصوم اور پُر خلوص نگہت کو سب کچھ بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لوں۔

میں اب اس لڑکی سے کنارہ کش ہو چکا ہوں۔

نگہت: سر شاہد کے کندھے سے لگا دیتی ہے۔ شاہد اس کے

چہرے کے تاثرات دیکھنے کو سر جھکا تا ہے۔

شاہد: میں جانتا تھا۔ میرے اعتراف سے تمہیں صدمہ پہنچے گا۔ لیکن میں تمہیں

اندھیرے میں رکھ کر بدگمانیوں کا شکار بھی نہیں ہونے دینا چاہتا۔ یہ لڑکی

فیض زدہ اور نئی تہذیب کی دلدادہ تھی۔ میرے عہدے اور روپے پیسے

سے فائدہ اٹھانے کے سوا اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ میری خوش نصیبی

ہے کہ تم جیسی بیوی مل گئی۔ اور میں فریب کا سنہری طلسم ٹوٹنا

دیکھ سکا۔

نگہت: شاہد!۔

شاہد: تم مجھے محبوب ہو۔ اتنی کہ دنیا میں تم سے زیادہ مجھے کوئی شے عزیز نہیں۔

اسی لیے میں نے تمہیں سب کچھ نیک نیتی اور خلوص سے بتا دیا ہے۔

میری لغزش کو معاف کر دو۔ میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دو نگہت۔

نگہت: (بے اختیار ہو کر) آپ کتنے اچھے ہیں۔ شاہد!۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔

شاہد: (اسے بازوؤں میں لے کر) نگہت!۔ تم نے میری لغزش بخش دی؟

نگہت: آپ بہت اچھے ہیں شاہد!۔ آپ نے اپنے ماضی کو میرے سامنے بکھر کر

میرے اعتماد کو جیت لیا ہے۔ آپ چاہتے تو یہ بات چھپا بھی سکتے تھے۔

شاہد: میں سچ کہہ رہا ہوں نگہت۔ یہ شادی کا تصور اتنا حسین نہیں تھا۔

نگہت: شکریہ۔

شاہد: تم بہت اچھی بہن ت۔

نگہت: آج بار بار اس اعتراف کی ضرورت یوں پیش آ رہی ہے۔

(شاہد کو دیکھ کر مسکرانے لگتی ہے)

شاہد: ہماری ازدواجی زندگی کتنی خوش گوار ہے۔

نگہت: (حیران ہو کر) اس کا منہ دیکھتے ہوئے اتنی۔

شاہد: (میں چاہتا ہوں۔ یہ ہمیشہ اس طرح خوش گزار رہے۔ اس کا ہاتھ منہ بھی

سے پکڑیتا ہے۔)

نگہت: انشاء اللہ اس طرح رہے گی۔

شاہد: (دروغی میں ہلکا کر گھبرائے انداز میں) نگہت!۔

نگہت: آپ کو کیا ہو رہا ہے۔

شاہد: میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

نگہت: (حیرت زدہ) کہیے۔

شاہد: نگہت!۔ شادی کے بعد ہم دونوں ایک ہو گئے ہیں۔

نگہت: (سر جھکائے ہوئے) یقیناً۔

شاہد: ہم دونوں میں کوئی راز!۔ کوئی پردہ نہیں ہونا چاہیے۔

نگہت: (بہرے پر گھبراہٹ) جی!۔ بالکل!۔ بالکل!۔

شاہد: میں اپنی بات تم سے چھپانا نہیں چاہتا!۔ نگہت!۔ میرے ضمیر پر جو بار

بے وہ اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔

نگہت: (دشدرسی اسے دیکھنے لگتی ہے) آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

شاہد: اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ معاف کر سکو گی۔

نگہت: جی!

شاہد: یہی بات تو مجھے گوارا نہ تھی۔ میرے اور تمہارے درمیان کسی بات کا پردہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟  
 نگہت: سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے آپ سوچتے ہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان کوئی پردہ نہیں ہونا چاہیئے۔  
 شاہد: نگہت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آج میں کتنا خوش ہوں نگہت۔ تم نہیں جان سکتیں۔

(نگہت سوچ میں ڈوب جاتی ہے)

شاہد: (کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے) تمہیں صدمہ پہنچا ہے نگہت۔

نگہت: (چونک کر) جی۔ نہیں۔!

شاہد: (گھبرا کر) چپ کیوں ہو گئی ہو۔ میرے بے باک اعتراف سے یقیناً تمہیں دھچکا لگا ہے۔ لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ کوئی اور تمہیں آگرتا تھا۔ تو تمہاری حالت غیر ہو جاتی اور میری پوزیشن تمہاری نظروں میں گر جاتی۔ لیکن اب تو تمہیں۔۔۔ فراخ دلی سے کام لینا چاہیئے۔ میری کوتاہی کو نظر انداز کرنا چاہیئے۔

نگہت: (بے اختیار ہو کر) آپ بہت اچھے ہیں شاہد۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ آپ عظیم ہیں۔ (اس کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہے)

شاہد: میری اچھی نگہت (اسے بازوؤں میں لے لیتا ہے۔)

(وہی ڈرائنگ روم۔ نگہت بے چینی سے ٹہل رہی ہے۔ اس کے چہرے پر تفکر کے آثار ہیں۔ سوچ میں ڈوب ڈوب جاتی ہے۔ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے)

نگہت: شاہد کتنے عظیم ہیں۔ انہوں نے اپنی محبت کا قصہ سنا کر اپنا ضمیر صاف کر لیا۔ واقعی ازدواجی زندگی کو ایسے راز ڈس جاتے ہیں۔ میاں بیوی میں کوئی راز نہیں ہونا چاہیئے۔ تو۔۔۔ تو کیا۔ مجھے بھی جمیل کے متعلق شاہد کو سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔ ہاں ضرور۔ میرے ضمیر پر بھی تو بلا کا بوجھ ہے۔ جمیل سے میرے تعلقات بے شک ویسے نہ تھے۔

جیسے شاہد کے سیمو سے تھے۔ پھر بھی۔ میں نے جمیل سے محبت کی تو تھی۔ محبت؟۔ نہیں یہ محبت نہیں تھی۔ جو ان لڑکے اور لڑکی کی قربت سے پیدا ہونے والے سٹائشی جذبات تھے جمیل تبدیل ہو کر چلا گیا۔ اس نے مجھے بھلا دیا۔ میری منگنی شاہد سے ہو گئی۔ میں جمیل کو بھول گئی۔ پھر شادی کے بعد تو جمیل ذہن سے ہی نکل گیا۔ لیکن اب بھی۔ کبھی کبھی پھانس سی جگر میں چبھتی ہے۔ کبھی شاہد کو کہیں سے جمیل کے بارے میں پتہ چل گیا۔ تو وہ۔۔۔ اُف۔ میری زندگی جہنم بن جائے گی۔ نہیں۔ میری یہ پیاری سی جنت، کتنی دلفریب

بھی — محبت —

شاہد: (چینج کر) کیا کہہ رہی ہوں نگہت۔

نگہت: (اپنی دھن میں) سوتج رہی ہوں۔ مجھے بھی آپ کو — سب — کچھ —

شاہد: (حالت دگرگوں) نگہت!!

نگہت: (حیران ہو کر شاہد کو دیکھتی ہے) آپ نے کہا تھا نا۔ کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی لازم نہیں رہنا چاہیے۔

شاہد: (سخت غصے میں بھر کر) آخر تم کہنا چاہتی ہو۔

نگہت: (ڈرتے ڈرتے اپنی شادی سے پہلے — کی محبت —

شاہد: (غصے سے آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں زور سے چختا ہے) کیا بکواس ہے — تم —

— تم — شادی سے پہلے محبت کر چکی ہو —؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں —

نگہت: (ہراساں ہو کر اسے دیکھتی ہے) آپ —

شاہد: (سخت غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے) میں ایس کوئی بات برداشت نہیں

کر سکتا۔ میری بیوی اک آوارہ —

نگہت: (چینج کر) شاہد —

شاہد: (غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ نگہت اسے دیکھتی رہتی ہے وہ خونخوار نظروں سے

نگہت کو دیکھتا ہے — پھر میز پر کلمہ مارتے ہوئے) یہ — سب کچھ تم نے

اب تک کیوں چھپائے رکھا — میں — تمہاری صورت نہیں — دیکھنا چاہتا۔

نگہت: (معالے کی نزاکت کو فوراً سمجھ جاتی ہے۔ چہرے پر مصنوعی بشارت لاتے

ہوئے کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے) توبہ — توبہ —! —

شاہد: (دگور کر اسے دیکھتے ہوئے) تم ہنس رہی ہو۔

نگہت: (اطمینان سے) مقام تو رونے کا ہے — لیکن آپ کی حالت دیکھ کر قہقہے

لگانے کو جی چاہتا ہے — حد ہو گئی — میرے مذاق کو اتنا سنجیدہ لیا۔

شاہد: (حیران ہو کر مذاق —

ہے۔ اسے اجڑنا نہیں چاہیے۔ مجھے بھی شاہد کی طرح ہمت سے کام لے کر

سب کچھ کہہ دینا چاہیے۔ میں نے شاہد کو معاف کر دیا تھا۔ شاہد مجھے معاف کر دیں

گے۔ پھر۔ پھر۔ کتنی حسین ہوگی ہماری زندگی — دونوں کے دل

آئینے کی طرح صاف ہوں گے۔ دونوں ایک ہو جائیں گے۔ نگہت اور

شاہد ایک وجود کے دو نام ہوں گے۔ مجھے ضرور شاہد کو سب کچھ بتا دینا

چاہیے۔ آخر شاہد نے بھی تو سب کچھ بتا ہی دیا۔ کل انہوں نے سمیعہ کے

دام فریب میں آنے کا اعتراف کیا۔ اور رات — اس کی ایک بات بتا

دی — میں نے بھی تو کس فراخ دل سے سب کچھ سنا — شاہد — بڑے

عظیم ہیں۔ ان سے کچھ چھپانا گناہ ہے۔ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔

(وہ نڈھال ہو کر صوفے پر گر جاتی ہے۔ چند لمحے یونہی گزر جاتے ہیں۔

پھر وائیں دروازے سے شاہد اندر آتا ہے۔ وہ بیخوش ہے ایک دلفریب

دھن گنگنا رہا ہے۔ نگہت کیوں نڈھال دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اس کے

قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے —)

شاہد: — نگہت — کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک تو ہے۔

نگہت: جی — ٹھیک ہوں۔

شاہد: کیا سوتج رہی ہو۔ کہیں میری باتوں سے اثر تو نہیں لے لیا۔ بخدا میں نے

تو ساری بات تمہیں خلوص اور محبت کی بنا پر بتا کر اپنا ضمیر صاف کیا تھا۔

نگہت: آپ نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ (سر جھکاتے ہوئے) آپ نے

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ اب میں — میں بھی سوچتی ہوں —

کہ اپنے دل —

شاہد: (چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگتا ہے۔ آنکھیں پھیل جاتی ہیں اس کی بات

کاٹ کر جلدی سے کہتا ہے) تم کیا کہنا چاہتی ہو —

نگہت: (انکساری سے سر جھکاتے ہوئے) شاہد — شادی سے پہلے میں نے

نگہت: اور نہیں تو کیا سچ — میں تو آپ کا حوصلہ آزما رہی تھی۔  
شاہد: رخصت سے نگہت۔

نگہت: اپنی محبت کا تو قصہ تفصیلاً سناتے رہے — لیکن جب میں —  
شاہد: رخصت سے) تمہیں ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

نگہت: عورت حقیقت برداشت کر جانے لگتی ہے۔ لیکن مرد سے مذاق بھی برداشت نہیں ہو سکتا۔ توبہ — توبہ رہنے لگتی ہے —

شاہد: رات بھر سوئے، تم نے تو میرا آدھا خون پانی کر دیا۔

نگہت: رکھ رکھا کر رہنے دیتی ہے۔ لیکن آنکھوں سے آنسو چھٹک جاتے ہیں، باہر سے شاہد کو دوست کے بلانے کی آواز آتی ہے۔ وہ نگہت کے گال پر پیار سے ہاتھ چھوتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ نگہت آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہے۔ اک گہرا ٹھنڈا سانس لے کر کہتی ہے۔  
نگہت: آف بیہ مرد۔

(بہتے آنسو — دوپٹے میں جذب کر لیتی ہے)

## ساڑھی

رنتوسط طبقے کا ایک کمرہ — دو پلنگ دیوار کے ساتھ لگے پڑے ہیں۔ جن پر رنگ دار بیڈ کوڑ پڑے ہیں۔ کونے میں لمبو ترے آئینے والی ڈرائنگ ٹیبل ہے جس پر بنا ڈسنگار کی متعدد چیزیں رکھی ہیں۔ ایک میز اور دو کرسیاں بھی دیوار کے ساتھ ہیں۔ کھڑکیوں پر کاٹن کے پردے ہیں۔ اور دو ایک معمولی سی سینریاں بھی دیواروں پر آویزاں ہیں پچیس پچیس سالہ خوش شکل شاہد پلنگ پر بیٹھی کپڑوں کو دیکھ رہی ہے۔ سامنے رکھے صندوق سے وہ کبھی ساڑھی کبھی سوٹ کبھی لہنگا نکال نکال کر دیکھتی ہے — اور ناپسند کر کے پلنگ پر ڈالے جاتی ہے —

شاہد: (سبز رنگ کی ہلکے سے بارڈر والی ساڑھی پھیلا کر سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے) یہ — لیکن — مسل مسل سی ہے۔ رات کا فکشن اور یہ ساڑھی — اچھی نہیں رہے گی — لیکن پھر پہنوں کیا — ہینگے کا سارا کامدانی کام ماند ماند پڑ چکا ہے۔ ہونہ — خاک اچھا لگے گا۔ ڈھنگ کا کوئی کپڑا بھی تو نہیں — (ساڑھی پھینک کر پھر پلنگ پر آ بیٹھتی ہے اور کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی ہے) یہ غرارہ — نہیں — سارا

شاہدہ: (ہنس کر) جی ہاں — شہر کی امیر کبیر بیگم ہیں۔ ان کے ہاں آج رت ڈنر ہے۔

نعیم: (تغجب سے) اور تم بھی مدعو ہو۔

شاہدہ: (خفزدہ تن کر) جی —

نعیم: (ٹٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے) تمہاری ان کی کب سے واقفیت ہے۔

شاہدہ: واقفیت؟ (ہنس کر) دوستی کہیئے۔

نعیم: اوہو — (اٹھ کر ٹٹائی کھونٹی پر ڈال دیتا ہے) دوستی اور بیگم نصیرہ حامد سے۔

شاہدہ: کیوں جی — کوئی اعتراض ہے آپ کو۔

نعیم: عجیب سی بات ہے۔

شاہدہ: (مسکراتے ہوئے) کیوں؟

نعیم: کہاں وہ کہاں تم —

شاہدہ: یہ کیا منطق ہوئی۔

نعیم: دوستی کے لیے کوئی بنیادی نسبت بھی تو ہونی چاہیئے شاہدہ — ایسے

لوگوں سے ہم لوگ واسطہ نہیں رکھ سکتے۔

شاہدہ: کیوں جی —؟ کیا ہم کسی سے کم ہیں۔ باہر اس ٹھاٹھ سے نکلتے ہیں کہ کسی

کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ ہماری ماہانہ آمدنی کل چار سو روپے ہے —

(ہنستی ہے)

نعیم: چار سو کو چار ہزار بن کر نمائش کرنا عقل مند ہی نہیں۔

شاہدہ: جانے دیجئے — دل خوش کرنے کا یہی ایک وسیلہ ہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔

نعیم: انسان کو اپنی چادر کے اندر ہی رہنا چاہیئے۔

شاہدہ: (مسکراتے ہوئے) بس اب بحث نہ شروع کر دیجئے گا۔

نعیم: اچھا صاحب! ڈنر کی خوشی میں ہمیں بھوکا رکھا جائے گا کیا؟

شاہدہ: آپ کپڑے تو بدلیئے — میں کھانا لاتی ہوں۔

کنارہ پاؤں میں روندنا ہوا ہے — اس کی کرتی بھی تو تنگ ہو گئی ہے۔

چھ سال ہو گئے شادی کو — (گہری آہ بھر کر متفکرانہ) کب تک چلتے یہ کپڑے

— اور پھر ڈیزائن بھی تو بدل جاتے ہیں — اب کون پہنتا ہے ایسے

کام والی چیزیں — تو — تو پھر — کیا پہنوں گی آج رات — مولیٰ

تنخواہ بھی تو اتنی نہیں کہ کسی مہینے کوئی قیمتی چیز خرید لی جائے —

ریا یوسی سے کپڑوں کو دیکھتی ہے) ہائے اللہ! کیا کروں — معمول سی

تقریب ہوتی — تو بات بھی تھی۔ سارے شہر کی بیگمات آتی ہوں گی

— ایک سے ایک اعلیٰ لباس میں ہوگی — اور اپنا — اپنا —

یہ حال — (کچھ سوچ کر چٹکی بجاتی ہے) ٹھیک — ٹھیک — کیا

فرق پڑے گا — بس ٹھیک ہے — (جلدی جلدی کپڑے سیٹھنے

لگتی ہے۔ نعیم اندر داخل ہوتا ہے — اس کے ہاتھ میں فائل ہے۔

چہرے پر پڑ مردگی کی دھوول — لباس بھی معمولی سا ہے — شکل و صورت

(اچھی ہے۔)

نعیم: ادہ — ہو — یہ کیا نمائش لگا رکھی ہے۔

شاہدہ: (گھوم کر اسے دیکھتی ہے) آپ آگئے۔

نعیم: جی آگیا (فائل میز پر رکھ کر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بوٹ اتارنے لگتا ہے)

یہ کپڑے کیوں نکالے ہیں؟

شاہدہ: آج رات دعوت پہ جانا ہے۔

نعیم: کہاں؟

شاہدہ: بیگم نصیرہ حامد کے ہاں۔

نعیم: بیگم نصیرہ حامد کے ہاں!

شاہدہ: (خفزدہ تن کر) جی ہاں۔

نعیم: وہ — وہ جو — بہت امیر —



نعیم: (مسکرا کر) تم کھا چکیں؟

شاہدہ: نہیں۔

نعیم: کھاؤ گی بھی نہیں؟

شاہدہ: کیوں؟

نعیم: رات دعوت جو ہے۔ دوپہر کا فاتہ کرو گی۔

شاہدہ: (رات کر) واہ جی آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ ایسی دعوتوں میں تو میں اتنا تکلف

برتنی ہوں۔ کہ اکثر بھوکا ہی رہنا پڑتا ہے۔

نعیم: یہ بھی فیشن ہو گا۔

شاہدہ: جی۔

نعیم: اچھا بھئی اب سیمٹو ان کپڑوں کو۔ یہ رات کے لیے لباس کا انتخاب

ہو رہا ہو گا۔

شاہدہ: (منہ ٹھکا کر) لیکن کپڑا تو کوئی ہے ہی نہیں جو رات پہن سکوں۔

نعیم: (تعجب سے) کیوں؟ یہ ڈھیر کس مرضی کی دوا ہے۔

شاہدہ: سب پرانے۔ مسئلہ ہوئے۔ اتنے بڑے اجتماع میں انہیں پہن

کر جباؤں۔

نعیم: جانا ایسا کون سا ضروری ہے بیگم۔

شاہدہ: کیوں نہیں! بڑے بڑے لوگوں سے تعارف ہو گا۔ شہر کی چیدہ چیدہ

بیگمات مدعو ہیں!

نعیم: تعارف نہ ہو گا تو کیا فرق پڑے گا۔

شاہدہ: ہائے اللہ آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ یہ تعارف بڑے کام کے ہوتے ہیں۔

پھر ہمارا بگڑتا ہی کیا ہے۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ کونسا انہیں اپنے

گھر بلانا پڑے گا۔

نعیم: اچھا بھئی تم جاؤ اور تمہارے کام۔ کھانا لاؤ بھوک لگی ہے۔

شاہدہ: (اٹھ کر اس کے قریب کھڑی ہو کر) کھانا کھانے کے بعد ایک کام کریں گے۔

نعیم: کیا؟

شاہدہ: وہ۔ آپ کی رشتہ دار۔ اسماء ہے نا۔ اسماء سلیم۔

نعیم: ہاں۔ ہاں۔

شاہدہ: اس کے ہاں جائیں گے۔

نعیم: کس لیے؟

شاہدہ: اس کے پاس بے انتہا، خوبصورت اور قیمتی ساڑھیاں ہیں۔

نعیم: (حیران ہو کر) امیر لوگ ہیں۔ ضرور ہوں گی۔ لیکن تم۔

شاہدہ: ایک سے ایک بڑھیا۔ ایک سے ایک قیمتی۔ کیا غضب کی ساڑھیاں

پہنتی ہے وہ۔ خاص کردہ۔

نعیم: تم کہنا کیا چاہتی ہو۔

شاہدہ: اس سے ایک ساڑھی مانگ لائیے۔

نعیم: میں؟

شاہدہ: (پریا سے) تو کیا ہوا۔ ایک ساڑھی ہی ہے نا۔ دو گھنٹے کی

تقریب ہے۔ پہن جاؤں گی۔ براؤن ساڑھی اس نے خالہ حمیدہ کی

بیٹی کی شادی پر پہنی تھی۔ اللہ کیا خوبصورت رنگ تھا۔ اور تلہ ایسا بھر پور

پوری محفل میں نمایاں تھی وہ اس ساڑھی سے۔

نعیم: (دھڑکا کر) شاہدہ۔ میں ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ مانگے

مانگے کی چیز۔

شاہدہ: (مسکرا کر) ہائے اللہ۔ مانگے مانگے کی چیز کیا ساڑھی کے اوپر لکھا ہو گا

یہ۔ اور کسی کو کیا پتہ چلے گا۔ ذرا اپنی شان بن جائے گی۔ (منہ بنا کر)

میں یہ سب کچھ آپ ہی کی عزت بنانے کے لیے کرتی ہوں۔ حمیدہ کی بیٹی

کی شادی پر اپنی دوست فخرہ کی چوڑیاں پہنی تھیں۔ رشتہ داروں کی آنکھیں

کھلی کی کھلی رہ گئیں — ہر ایک نے پوچھا کب بنو ایٹیں — نعیم بڑا اچھا ہے۔  
 بیوی کو چوڑیاں بنوادیں۔ میں نے بھی آپ کی وہ وہ تقریفات کیں۔ وہ وہ  
 تقریفات کیں۔  
 نعیم: شکریہ — شکریہ — لیکن معاف کرنا — میں تمہارے لیے ساڑھی  
 مانگنے نہیں جاؤں گا۔

شاہدہ: سائیکل پہ پانچ منٹ کا راستہ ہے۔ آپ کا ہرج بھی کیا ہے۔  
 نعیم: جی نہیں — مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا — کہ بیگم صاحبہ کے لیے ساڑھی مانگنے  
 جاؤں — تاکہ بیگم صاحبہ کی تقریب میں شان بن سکے۔

شاہدہ: نام تو آپ ہی کا ہو گا نا —

نعیم: تم میرے نام کو رہنے ہی دو۔

شاہدہ: تو میں خود ہی چلی جاؤں۔

نعیم: شرم نہ آئے گی مانگتے ہوئے۔

شاہدہ: شرم کی کیا بات — کوئی یہ تھوڑا ہی کہوں گی۔ کہ تقریب میں پہننے کے

لیے ساڑھی دے دو۔

نعیم: تو اور —

شاہدہ: کسی اور طریقے سے لاؤں گی — (ہنس کر) سانپ بھی مرے لائٹھی بھی

نہ ٹوٹے — اپنی عزت کا بھرم تو رکھنا ہی ہوتا ہے نا — آپ کیا

سمجھتے ہیں۔

نعیم: کچھ نہیں — کچھ نہیں۔ چلو کھانا لگا لو۔

شاہدہ: چلیے۔

(دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل جاتے ہیں)

جدید طرز کا ڈرائنگ روم — فوم کے خوبصورت صوفے پر اسماء  
 اور شاہدہ بیٹھی ہیں — سامنے ٹرائل پر کھانے پینے کی چیزیں  
 رکھی ہیں —

اسماء: ریلیٹ شاہدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے، یہ لیں نا شاہدہ بہن۔

شاہدہ: شکریہ — (اپنی پلیٹ میں مالٹے کی قاشیں رکھ لیتی ہے) سنائیے،

کیا حال چال ہے؟

اسماء: اللہ کا شکر ہے — آپ اپنی کہیئے۔

شاہدہ: سب ٹھیک —

اسماء چائے بنانے لگتی ہے۔ شاہدہ ساڑھی کے متعلق کہنے کا سوچتے

ہوئے اس کی طرف دیکھتی ہے)

شاہدہ: میں آج ایک خاص کام سے آئی ہوں اسماء۔

اسماء: (چونک کر) جی؟ — جی فرمائیے۔

شاہدہ: (بٹتے ہوئے) نعیم آج رات کراچی جا رہے ہیں۔

اسماء: (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) جی — اچھا — کسی کام سے جا رہے ہوں گے۔

شاہدہ: سرکاری ڈیوٹی پہ جا رہے ہیں۔ (جھجک کر) ایک ہفتے کے دورے پہ جا

رہے ہیں۔ میں نے — سوچا — اپنے لیے ایک ساڑھی منگوا لوں۔

اسماء: (کچھ نہیں سمجھتی تھی)۔

شاہدہ: (ہنس کر) جس قسم کی ساڑھی میں منگوانا چاہتی ہوں نا — نعیم کو سمجھانے کے باوجود انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا۔

اسماء: (خواہ مخواہ مسکرا کر) مردوں کو خورتوں کی چیزوں کا کیا پتہ۔

شاہدہ: (نعیم کو) کچھ بھی پتہ نہیں — دراصل آج تک میری کوئی چیز انہوں نے خریدی ہی نہیں میں خود ہی خریدتی ہوں۔

اسماء: (بے دلی سے مسکرا کر) جی رچائے کی پیالی شاہدہ کی طرف بڑھا دیتی ہے۔

شاہدہ: شکریہ رچائے کا گھونٹ لے کر قریبی تپائی پر پیالی رکھ دیتی ہے (دہ آپ نے حیدہ خالہ کی بیٹی پر براؤن ساڑھی پہنی تھی نا —

اسماء: (یاد کرتے ہوئے) کون سی؟

شاہدہ: (نارسی — بڑے سے بارڈروالی — چوکور خانوں میں پھول نے تھے؟

اسماء: (یاد کرتے ہوئے) آں — ہاں — ہاں ہاں — یاد آگئی — دراصل

میرے پاس تین چار ساڑھیاں براؤن رنگ کی ہیں۔ اچھا وہ چوکور خانوں

والی ساڑھی۔

شاہدہ: (مرعوب ہو کر) جی ہاں — وہ ساڑھی۔

اسماء: بڑی قیمتی ساڑھی ہے وہ —

شاہدہ: میں بھی کچھ دیسی ہی ساڑھی منگوانا چاہتی ہوں۔ آپ جانیں بڑی بڑی

تقریبات میں شرکت کرتی ہی رہتی ہوں — اس لیے — اچھی اچھی

ساڑھیوں کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔

اسماء: جی ہاں — بجا کہتی ہیں۔

شاہدہ: آپ کی یہ ساڑھی مجھے بہت پسند آئی تھی۔

اسماء: (انحسار سے مسکراتی ہے) مجھے بھی بے حد پسند ہے۔

شاہدہ: اب نعیم کو سمجھا سہجھا کر تھک گئی۔ انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا۔ سوچا آپ کی

ساڑھی انہیں دکھا دوں۔

اسماء: (ایک دم) لیکن — وہ ساڑھی — تو امی نے انڈیا سے منگوائی تھی! ایسی

شاہدہ کراچی سے نہ ملے۔

شاہدہ: (جلدی سے) دیسی نہ ملے — اسی قسم کی لے آئیں گے۔ وہ — تو

میں جانتی ہوں۔ بڑی قیمتی ساڑھی ہوگی۔

اسماء: اسی سے ملتی جلتی میں نے یہاں ایک دکان پر دیکھی تھی۔ پتہ ہے قیمت

کیا بتائی اس نے۔

شاہدہ: جی — یقیناً بہت ہوگی۔

اسماء: تین ہزار — اولی اللہ — میں تو سن کر حیران رہ گئی۔ اس دن سے

میں تو بڑی احتیاط برتنے لگی ہوں — ساڑھیوں کے معاملہ میں۔

شاہدہ: (قدر سے گھبرا کر) ابھی اتنی قیمتی ساڑھی خریدنے کی استطاعت تو ہم میں

نہیں — میں صرف نعیم کو دکھانا چاہتی ہوں۔ انہیں تو بارسا ساڑھیوں

کی الف بے کا بھی پتہ نہیں۔ (رہنستی ہے) — بالکل مصنوعی اور پیکبی ٹنسی۔

اسماء: ہوں —

شاہدہ: آپ ساڑھی دکھانے کو دے دیں۔ صبح واپس بھجوا دوں گی۔

اسماء: (بے دلی سے) لے جایئے — لیکن کراچی سے ایسی ساڑھی ملے

گی نہیں۔

شاہدہ: (خواہ مخواہ ہنس کر) ابھی ایسی تو منگوانے سے رہی۔ اس سے ملتی جلتی

ہلکی قسم کی تولادیں گے نا؟ صرف انہیں دکھانا ہی ہے — انہیں اندازہ

تو ہو جائے گا نا —

اسماء: لے جایئے —

شاہدہ: شکریہ۔

اسماء: آپ چائے تو پیجئے — ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

شاہدہ: جی پی رہی ہوں دچائے کی پیال اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیتی ہے۔  
(چائے کی پیالی خالی کر کے شاہدہ میز پر رکھ دیتی ہے۔ شاہدہ بھی چائے پیتی ہے)۔

اسماء: اور بناؤں۔

شاہدہ: جی نہیں بس شکریہ۔ (گھڑی دیکھ کر) کافی وقت ہو گیا ہے۔ اب اجازت چاہوں گی۔ (مسکرا کر) ساڑھی۔

اسماء: (اٹھتے ہوئے) میں لاتی ہوں۔

(اسماء کمرے سے نکل جاتی ہے) شاہدہ رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں فاتح کی سی چمک ہے۔ کچھ دیر بعد اسماء سفید لٹھے کے رومال میں احتیاط سے تہہ کی ہوئی ساڑھی لے کر آتی ہے) اسماء: لیجئے۔

شاہدہ: (خوشی سے) شکریہ۔

اسماء: دیکھ لیجئے۔ یہی چاہیے تھی نا۔

شاہدہ: شاہدہ (رومال کھول کر) جی یہی۔ اُن کتنی خوبصورت چیز ہے۔

اسماء: ذرا احتیاط سے رکھیے گا۔ میں نے صرف ایک دفعہ ہی پہنی ہے۔

شاہدہ: (بھینپ کر) جی بس صرف نعیم کو دکھانا ہی ہے۔ صبح آپ کی امانت لوٹا دوں گی۔

اسماء: (اخلاقاً) کوئی بات نہیں۔

شاہدہ: (ساڑھی اٹھا کر گھڑی ہو جاتی ہے) بہت بہت شکریہ۔ جانے کے لیے قدم اٹھاتی ہے۔ اسماء بھی دروازے تک آتی ہے،

شاہدہ: خدا حافظ۔

اسماء: خدا حافظ۔

(شاہدہ کا وہی کمرہ۔ بلب روشن ہے۔ شاہدہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسماء کی براؤن ساڑھی پہنے اپنے میک اپ کا آخری جائزہ لے رہی ہے۔ نعیم پلنگ پر نیم دراز ہے۔ وہ نگاہ شوق سے شاہدہ کو دیکھ رہا ہے۔)

شاہدہ: (دڑک کر نعیم کے سامنے آتی ہے) بس ٹھیک۔

نعیم: (قدرے اٹھتے ہوئے مسکرا کر) واہ۔ وا۔ قیامت بن گئی ہو۔

شاہدہ: (اترا کر) کیوں جی ہم کسی سے کم ہیں کیا؟

نعیم: (اٹھ کر اس کے قریب آ جاتا ہے) سر! یا قیامت نظر آ رہی ہو۔ خدا قسم! مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ تم اتنی حسین ہو۔

شاہدہ: (شرما کر) بیٹھے جی۔ اب بنائے نہیں۔

نعیم: کون کا فر غلط کہہ رہا ہے (اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے)

شاہدہ: ہائے اللہ (مسکرا کر) آپ تو بیکنے لگے رہے ہٹ جاتی ہے)

نعیم: تمہیں دیکھ کر نشہ آ گیا۔

شاہدہ: یہ ساڑھی کا کمال ہے۔

نعیم: واقعی!

شاہدہ: کیا شان ہوگی ہماری۔ آج رات۔ واہ۔ وا۔ ان بیگمات کی مرثیت

شاہدہ: اچھا جی — اب تشریف لے جایئے۔ مجھے وقت پر پہنچنا ہے رکشا لے بھی آئیئے۔  
نعیم: بہت اچھا حضور (ہنس کر) رکشا تو رکشا اس وقت موٹر کا حکم دیتیں تو کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا۔

شاہدہ: رکشے میں جاتے ہوئے برا تو موس ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔  
نعیم: سب مہمان موٹروں ہی میں آئیں گے۔  
شاہدہ: یقیناً۔

نعیم: اور جناب۔  
شاہدہ: میں رکشا ان کی کوٹھی تک توڑا ہی لے جاؤ گی۔  
نعیم: تو پھر؟

شاہدہ: ذرا پرے ہی اتر جاؤں گی — رکشے پر جا کر بے عزتی کروانا ہے میں نے۔  
پیدل جانا اتنا معیوب نہیں جتنا رکشے پہ — خاص کر اتنی بڑی تقریب میں — (اٹھلا کر) بیگم نعیم احمد کوئی چھوٹی موٹی اسامی نہیں ہے جناب۔  
نعیم: اچھا جی۔

اس کی گال سارے تھککتے ہوئے کمرے سے نکل جاتا ہے۔  
شاہدہ پھر ڈریسنگ ٹیبل کی جانب مڑ جاتی ہے — اور اپنے ہونٹوں پر سرخی کی ایک اور تہہ جانے لگتی ہے —

∴

بڑی نرالی ہوتی ہے نعیم — ہوتے سوتے بھی دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر جل جاتی ہیں — ہونٹ — آج بڑا لطف آئے گا۔

نعیم: (ہنس کر) مردوں کا داخلہ بند ہے وہاں؟  
شاہدہ: کیوں؟ ساتھ جانے کو جی چاہنے لگا؟  
نعیم: بالکل — (شوخی نظروں سے شاہدہ کو دیکھ کر اس کے قریب آنے لگتا ہے)  
شاہدہ: (اٹھلا کر دوڑ بٹ کر) بس بس۔

نعیم: خدا قسم آج تو تم بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آ رہی ہو — یوں لگتا ہے جیسے کوئی پری —

شاہدہ: (بہنتے ہوئے) بندہ پرورشاعری چھوڑیئے — اور کشا لادیجئے۔  
نعیم: ابھی تو کافی وقت ہے (گھڑی دیکھ کر) دس منٹ میں ان کے ہاں پہنچ جاؤ گی۔  
شاہدہ: رکشا ملتے بھی تو کچھ دیر لگے گی نا —  
نعیم: رکشے بہت (ہنس کر) فدا جلوے تو دیکھ لینے دو۔  
شاہدہ: تو بیا اللہ — (پھر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے) اس کے پیچھے نعیم بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔

(دونوں آئینے میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں —)

شاہدہ: (مڑ کر) اب رکشا لے بھی آئیئے نا —  
نعیم: اتنا قیمتی لباس اور جاؤ گی رکشے میں۔

شاہدہ: اور کس میں جاؤں۔

نعیم: (مذاقاً) ساڑھی مانگ لائی تھیں۔ موٹر بھی مانگ لیتیں۔  
شاہدہ: (کھٹکھٹا کر بہنتے ہوئے) ساڑھی تو دکھانے کے بہانے لائی تھی۔ کہ ایسی ہی منگوانا ہے۔ موٹر کا کیا کہتی۔

نعیم: موٹر کا بھی یہی کہہ لیتیں — خریدنا ساڑھی تھی نا موٹر — کام بن جاتا۔  
(دونوں ہنس پڑتے ہیں —)

یہ دیکھیں (اپنی ساڑھی دکھاتے ہوئے) یہ ساڑھی میں نے ساڑھے پانچ سو کی خریدی تھی — کتنی ماند نظر آرہی ہے اس کے سامنے۔

بیگم نصیرہ حامد: یہ انڈیا سے کتنے میں آئی تھی۔  
شاہدہ: (قدرے گھبرا جاتی ہے۔ لیکن مسکرا کر کہتی ہے) جی مجھے پتہ نہیں۔ (ہنس کر)  
یہ ساڑھی امی نے ہماری شادی کی پانچویں سالگرہ پر دی تھی۔  
بیگم راشدہ: کتنی خوش قسمت ہیں آپ بیگم نعیم۔

شاہدہ: رہتے ہوئے، کیوں؟  
بیگم راشدہ: پانچویں سالگرہ پر اتنا قیمتی تحفہ — خوش قسمتی ہی ہے نا۔  
بیگم نصیرہ: والد کی اکلوتی بیٹی لگتی ہیں۔  
شاہدہ: (ہنس کر) جی۔ جی ہاں۔  
بیگم سعیدہ: بھئی خوبصورت اور لا جواب شے ہے۔ نظر نہ لگ جائے۔  
بیگم نصیرہ حامد: واقعی — ماشاء اللہ بڑی پیاری لگ رہی ہیں۔  
بیگم واحدہ: کیوں نصیرہ — آج باتیں ہی ہوں گی (ہنس کر) ساڑھی کی تعریف تو ہولی — اب پیٹ پوجا —

بیگم سعیدہ: ابھی خاص دیر تو نہیں ہوئی بیگم واحدہ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔  
بیگم واحدہ: بھئی وقت تو کافی ہو گیا ہے۔ (گھڑی دیکھتی ہے)  
بیگم نصیرہ: (ہنس کر) میرا قصور نہیں — بیگم واحدہ — کھانا تیار ہے۔ صرف دو تین مہانوں کا انتظار ہے۔ اب تک انہیں آجانا چاہیئے تھا۔

(رہارن کی آواز)

بیگم نصیرہ: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میرا خیال ہے آگئے —

(باہر نکل جاتی ہے)

بیگم راشدہ: بیگم نصیرہ حامد کی ساڑھی بھی کافی خوبصورت ہے۔

بیگم سعیدہ: لیکن شاہدہ نعیم کی ساڑھی کے سامنے ماند نظر آرہی ہے —

بیگم نصیرہ حامد کا شاہانہ ڈرائنگ روم — بڑے بڑے قیمتی صوفے —  
ارغوانی قالین — ریشمی پردے خوبصورت آرٹسٹری چیزیں۔ ہر چیز سے شان  
امارت ٹپک رہی ہے۔ رنگ برنگے بھڑکیے بلوسات — زیوروں کی کھٹک —  
ہنسی مذاق چہچہے قہقہے، غرضیکہ خوب گما گمی ہے — بیگم نصیرہ حامد سفید  
بنارسی ساڑھی میں بلوس مہانوں کی احوال پرسی کر رہی ہے — شاہدہ اک  
شان اتنا بازی سے بیگم راشدہ، بیگم واحدہ اور بیگم سعیدہ کے ساتھ مصروف گفتگو  
ہے۔ بیگم نصیرہ حامدان کے پاس آتی ہے۔

بیگم نصیرہ حامد: ہو — کیا حال ہے — (قریب بیٹھ جاتی ہے)

شاہدہ: شکریہ — شکریہ۔

بیگم نصیرہ حامد: کتنی پیاری لگ رہی ہو — کتنی خوبصورت ساڑھی ہے۔

بیگم راشدہ: واقعی — بے نظیر چیز ہے۔

بیگم واحدہ: میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ لا جواب ساڑھی ہے۔

شاہدہ: (غصے) شکریہ —

بیگم سعیدہ: کہاں سے خریدی تھی۔

شاہدہ: جی — یہ انڈیا سے آئی ہے۔

بیگم راشدہ: وہ تو ظاہر ہی ہے — انڈیا کی ساڑھیوں کا تہ اور ہی ہوتا ہے۔

— میرادل — گھبرا رہا ہے — چکر — چکر — چکر —  
 (بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے)  
 بیگم سعید: ہائے اللہ انہیں کیا ہو گیا — بیگم راشد ذرا سہارا دے کر لے چلتی ہیں انہیں —  
 بیگم راشد: وہ تو خود بھاگ گئی ہیں — کہیں گر نہ گئی ہوں —  
 بیگم نصیرہ: میں جاتی ہوں — انہیں لٹا دوں — ذرا تم بھی آنا میرے ساتھ —  
 بیگم راشد اور بیگم نصیرہ جاتی ہیں — شاہدہ جا چکی ہے —  
 (دو عورتوں کی آپس میں چہ مے گوشتاں ہوتی ہیں —)  
 ایک عورت: سب سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی تھیں —  
 دوسری عورت: بیچاری کو نظر لگ گئی —  
 تیسری عورت: ساڑھی بے حد خوبصورت تھی — شکل بھی اچھی — اس پر اتنی  
 خوبصورت ساڑھی —  
 (سب عورتیں باتیں کرتی ہیں — اسماء کے ہونٹوں پر طنز یہ مسکراہٹ چمک  
 رہی ہے —)  
 اسماء: (زیر لب مسکراتے ہوئے) واقعی — یہ اس خوبصورت ساڑھی کا قصور  
 ہے —  
 ہنستی ہے عورتیں اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگتی ہیں —

(شاہدہ سے) آج تو پوری محفل میں آپ نمایاں ہیں — سب کا نمبر کاٹ گئیں —  
 شاہدہ: (عجز سے) ہائے اللہ — آپ تو مغالطے پر اتر آئیں — کوئی ایسی بڑھیا  
 بھی نہیں ساڑھی — امی نے جو ننھے کے پیدا ہونے پر مجھے ساڑھی دی  
 تھی — آپ وہ دیکھیں — تو حیران رہ جاتیں —  
 بیگم راشد: (حسد سے) تو — تو اس سے بھی بڑھیا ساڑھی ہے آپ کے پاس —  
 شاہدہ: (عجز کا اظہار) جی — یہ تو کچھ بھی نہیں — امی کی پسند بھی بہت  
 اچھی ہے نا —  
 بیگم واحد: (منہ بنا کر) خالی پسند کیا — پیسہ بھی ہونا چاہیے — آپ کی خوش نصیبی  
 ہے — جو امیر کبیر والدین کی اکلوتی بیٹی ہیں —  
 بیگم سعید: خوب مزے ہیں آپ کے —  
 شاہدہ: جی — اللہ کی مہربانی ہے — ورنہ آپ جانیں آجکل تنخواہوں میں کیا  
 بنتا ہے — ڈیڑھ دو ہزار میں بھی پوری نہیں پڑتی —  
 بیگم راشد: (حاسدانہ) آپ کو تو واقعی ڈیڑھ دو ہزار بھی کچھ نہیں لگتا ہوگا —  
 بیگم نصیرہ دروازے سے اندر آتی ہے — اس کے ساتھ اسماء خوبصورت  
 ساڑھی پہنے اندر آتی ہے — شاہدہ کی نظر اسماء پر پڑتی ہے — رنگ  
 فاق ہو جاتا ہے — ہاتھ پاؤں سنسناتا ہے — اسماء بھی اسے  
 دیکھتی ہے — اپنی ساڑھی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طنز کی چمک آ جاتی  
 ہے —

بیگم راشد: کیا ہوا؟ بیگم نعیم — آپ کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا —  
 بیگم واحد: یہ تو شاید بے ہوش ہو رہی ہیں —  
 بیگم نصیرہ: (لپک کر ادھر آتی ہے) نظر لگ گئی انہیں — اسماء بھی ادھر آتی  
 ہے — شاہدہ کا گھبراہٹ سے بُرا حال ہے —  
 شاہدہ: (اٹھ کر دوسرے دروازے کی طرف بھاگنے لگتی ہے —) اُف



نا — چپ ہو جاوے اور تھپڑ لگاؤں گی — پھر نام لے گا ہوائی جہاز کا۔  
رونی: (روتے روتے) ہوائی جہاز — لوں گا —

ناصرہ: (جھنجھوڑتے ہوئے) ڈھیٹ کہیں کا — (تھپڑ لگاتی ہے) ہوائی جہاز  
— ہوائی جہاز — نام لے ہوائی جہاز کا جو تیری زبان نہ کھینچ لی —  
رہا نپ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے — بچے کا منہ اپنے دوپٹے سے پونچھنے  
لگتی ہے، ہزار بار پیار سے سمجھایا ہے لوگوں کے پاس چیزیں دیکھ کر ضد  
کرنا بری بات ہے — لیکن سمجھتا ہی نہیں — ریل گاڑی کی ضد چھوڑی —

تو اب ہوائی جہاز دیکھ لیا — ایک ہی ضد ہفتہ بھر سے لگا رکھی ہے —  
رٹ چھوڑنا ہی نہیں — کہاں سے لا کر دیں تمہیں پندرہ بیس روپے  
کا کھلونا — کان کھول کر سن — تو آج سے حاطف کے گھر گیا تو چھڑی اڑھیر  
دو لگی — (اپنے آپ سے) لوگوں کی تو حرام کی کماٹی ہے — بیس بیس،  
تیس تیس روپے کا کھلونا ہی بچوں کے لیے آتا ہے — ہونہ — ایک ہی  
محکمے کی نوکری — یہاں روٹی بھی نہیں چلتی — اور وہاں رات  
شب برات اور دن عید ہیں — تنخواہ ڈھائی سو روپے اور اخراجات ڈھائی  
ہزار سے بھی اوپر — (روہانسی آواز) دوسروں کے لیے مصیبت بن  
گئے ہیں یہ لوگ — (بچہ رول رول کیے جا رہا ہے) ناصرہ پھر  
اس کی طرف دیکھ کر غصے میں آجاتی ہے، چپ ہو گیا یا نہیں — تیری ضد  
تو پوری ہونے سے رہی — کھال کھنچو الے گا مجھ سے آج بچے کو جھنجھوڑ  
کر پلنگ پر بیٹھ دیتی ہے — بچہ زور زور سے رونے لگتا ہے —

ناصرہ: ذلیل — دایات — چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا —  
(صغیر کمرے میں داخل ہوتا ہے — اٹھائیس تیس سالہ نوجوان ہے —  
لیکن چہرے پر لاشائست نام کی کوئی چیز نہیں — بچے کو روتے دیکھ کر لپک  
کر ناصرہ کی طرف آتا ہے) —

## پہلی تاریخ

(ایک چھوٹا سا کمرہ — دو معمولی سے پلنگ ہیں جن پر رنگین چارخانی چادریں  
پڑی ہیں — دائیں دیوار پر کونہی ہے جس پر زنانہ اور مردانہ کپڑے لٹک رہے  
ہیں — مشرقی کونے میں دو تین صندوق اوپر تلے پڑے ہیں — جن پر سفید کپڑے  
ترتیب سے ڈالے ہوئے ہیں — دو کرسیاں اور ایک میز بھی دیوار کے ساتھ  
لگے پڑے ہیں — میز پر دو تین کتابیں اور ایک معمولی سا ٹرانسپیرنٹ ہے —  
کمرے کے عین وسط میں پچیس چھبیس سالہ ناصرہ اپنے پانچ چھ سالہ بچے رونی  
کو جھنجھوڑتے ہوئے چنچ رہی ہے — ناصرہ کے چہرے پر بڑمردگی کا تاثر ہے  
اپنی عمر سے کئی سال بڑی دکھائی دے رہی ہے — کاٹن کے معمولی سے  
کپڑے پہن رکھے ہیں — بچہ روئے جا رہا ہے —)

ناصرہ: (رونی کے ایک تھپڑ لگاتے ہوئے) ریں — ریں — بس ہی نہیں  
کر رہا — چپ ہو جا — ورنہ — کم بخت — خدا جانے کہاں سے دیکھ آتا  
ہے رنگ برنگی چیزیں — کبھی ایک کے لیے ضد کبھی دوسری کے لیے —  
جیسے نواب زادہ ہو — اتنا ضدی ہو گیا ہے — بس جو بات زبان سے نکالے —  
وہ پوری ہی ہونی چاہیے — ہونہ — باپ کے خزانے کھلے پڑے ہیں



صغیر: کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ مار رہی ہونا رونی کو۔

راجہ باپ کو دیکھ کر زور زور سے رونے لگتا ہے۔ صغیر رونی کو بازوؤں میں لے کر ناصرہ کی طرف دیکھتا ہے۔ ناصرہ منہ نہایت کھڑی رہتی ہے۔  
صغیر: (رونی کو پیار کرتے ہوئے) کیا ہو گیا میرے بیٹے کو۔ کیوں پٹائی ہوئی۔  
ناصرہ: کیوں مارا؟

ناصرہ: دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔

صغیر: (رہنہ کر) وہ تو ظاہر ہی ہے۔ ہزار بار کہا ہے بچے کو کچھ نہ کہا کرو۔ ڈھیٹ ہو گیا ہے اسی لیے۔ (سنجیدگی سے) لیکن تم ہو۔ کہ۔ (رہنہ سسکتا ہے)  
ناصرہ: بس رہنے دیجئے۔ آپ نے شہ دے دے کر ہی اسے خراب کر ڈالا ہے۔ بات تو مانتا ہی نہیں۔ ضدی اتنا ہو گیا ہے کہ جو بات منہ سے نکل جائے وہ پوری کروا کے رہتا ہے۔

صغیر: ادھو۔ بچہ ہی ہے نا۔ بڑا ہو گا۔ تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ مارنے سے تو اور خراب ہو گا۔

ناصرہ: (جھلا کر) تو لا دیجئے صاحب زادے کو، پندرہ بیس روپے کا ہوائی جہاز۔  
صغیر: (رونی سے) کیسا ہوائی جہاز بیٹے۔

رونی: (آنکھوں میں مٹھیاں گھیسرتے ہوئے) جیسا عاطف کے پاس ہے۔  
صغیر: کھلونا؟

رونی: (بوجہ جانی سے اڑتا ہے) رونا بھول کر ہاتھوں کے اشارے سے بتاتا ہے۔ یوں۔۔۔ اوتیوں۔۔۔

صغیر: (رہنہ کر) کتنا بڑا ہے۔

رونی: اتنا (دونوں ہاتھوں سے پھر معصومانہ اشارہ کرتا ہے)

ناصرہ: اسے لاکھ بار سمجھا چکی ہوں۔ کہ عاطف کی چیزوں کو دیکھ کر صند نہ کیا کرے۔  
پر البیادھیٹ ہے۔ مانتا ہی نہیں۔

صغیر: ناصرہ۔۔۔ تم تو بنگلی ہو۔ بچہ ہے تا آخر۔ اسے کیا پتہ؟

ناصرہ: بچہ ہے۔۔۔ بچے کو سمجھ لینا چاہئے نا۔

رونی: ابو۔۔۔ میں بھی ہوائی جہاز لوں گا۔

ناصرہ: دیکھا صغیر کی طرف غصے سے دیکھتی ہے۔

صغیر: (رونی سے) اچھا بیٹے آپ کو بھی لادیں گے ہوائی جہاز۔

ناصرہ: اسے ہے۔۔۔ لادیں گے ہوائی جہاز۔ کیوں بچے سے جھوٹا وعدہ کر رہے ہیں۔

صغیر: جھوٹا وعدہ کیوں۔۔۔ لادیں گے اپنے رونی بیٹے کو جہاز۔ کیا یاد کرے گا۔ کس ریٹس باپ سے پالا پڑا۔

ناصرہ: (جھلا کر) رہنے دیں۔ پندرہ بیس روپے کا ہوائی جہاز اور لادیں گے رونی بیٹے کو۔ ایسے پونچلیوں کی ضرورت نہیں۔

رونی: رماں کو گھور کر دیکھتے ہوئے باپ سے لپٹ جاتا ہے، ابو۔۔۔ لادیں گے نا۔

صغیر: ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔

رونی: (چہرے پر لازوال سی خوشی صغیر اسے سینے سے لگا لیتا ہے) ابو کب لادیں گے۔ آج؟

صغیر: آج نہیں بیٹے۔

رونی: پھر کب ابو۔

صغیر: پہلی تاریخ کو۔۔۔ تنخواہ ملے گی نا۔۔۔ سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔

رونی: (رجوش مسرت سے تالیاں بجانے لگتا ہے) آہا۔۔۔ میرے پاس بھی ہوائی جہاز ہو گا۔ آہا۔۔۔ آہا۔۔۔ رکو دکر پلنگ سے نیچے اترتا ہے اور کمرے سے دوڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ صغیر اسے

ناصرہ: (ناک منہ چڑھا کر) اپنے ویں جی۔ نفیات؟ — غریبوں کے بچوں۔  
 صغیر: (بات کاٹ کر) چلو چھوڑو ان باتوں کو — چائے بناؤ — آج دفتر  
 میں بڑا کام کیا ہے — سر دکھ رہا ہے — گرم گرم چائے پلا دو —  
 ناصرہ: (کمرے سے باہر نکلتے ہوئے) آپ نے رونی سے وعدہ کر کے  
 اچھا نہیں کیا۔  
 صغیر: اودہ — رینگ پر لیٹ کر گنگنانے لگتا ہے — ناصرہ کمرے سے  
 نکل جاتی ہے۔

محبت سے دیکھتا ہے اور پھر ناصرہ کی طرف رخ پھیر لیتا ہے۔  
 ناصرہ: (سر کو جنبش دیتی ہے) ہونہ۔  
 صغیر: تم تو سسکی ہو — سسکی۔  
 ناصرہ: جی ہاں؟  
 صغیر: خواہ مخواہ بے چارے کو پیٹ رہی تھیں — کتنا خوش ہو گیا —  
 اس کا چہرہ دیکھا تھا۔  
 ناصرہ: (بات چبا چبا کر) جی! دیکھا تھا —  
 صغیر: اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر بیس روپے قربان کر دیں گے جی۔  
 ناصرہ: بیس روپے ہیں۔ بیس پیسے نہیں۔  
 صغیر: جانتا ہوں۔  
 ناصرہ: ہم ایسی خرافات کے متحمل ہو سکتے ہیں؟  
 صغیر: اودہ — ناصرہ (رینگ پر بیٹھ جاتا ہے) یہ سوچنا شروع کر دوں۔  
 توجینا دو بھر ہو جائے۔ گاڑی کیلینچن چلی جا رہی ہے۔ بس یہی  
 کافی ہے — بچے کی خوشی پوری ہو جائے گی۔ اپنا حال تو جیسا ہے  
 دلیا ہی رہے گا۔  
 ناصرہ: یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ آج پندرہ بیس روپے اس  
 کی ضد پر خرچ کر دیئے۔ تو کل کوئی اور بڑی چیز دیکھ کر  
 مچل بیٹھے گا۔  
 صغیر: جب مچلے گا — دیکھا جائے گا۔ مجھ سے تو اس کے چہرے کی  
 محرومی نہیں دیکھی گئی۔  
 اور ناصرہ — تم تو پڑھی لکھی عورت ہو — جانتی ہو — بچے  
 کی شخصیت محرومیت سے کس بری طرح مسخ ہوتی ہے — کچھ  
 تو نفیات۔

رونی: ابو۔۔۔ پہلی تاریخ کو ہوائی جہاز آئے گا۔

صغیر: ضرور۔۔۔ ضرور!

(رونی خوشی سے ہچکچاہٹیں لگاتے کمرے میں چلا جاتا ہے)

صغیر: کتنا خوش ہو رہا ہے رونی۔۔۔ جہاز مل جانے پر اس کی خوشیوں کا اندازہ تو کرو۔

ناصرہ: میں نے منع بھی کیا تھا۔ ایسا وعدہ بچے سے نہ کریں۔۔۔ ٹال دیتے تو اچھا تھا۔

صغیر: کیوں؟ ہو کیا گیا۔ پندرہ بیس روپے کے لیے بچے کی خوشیوں کو مجروح کر دیا جائے۔

ناصرہ: رجھلا کر وہ پندرہ بیس آئیں گے کہاں سے۔

صغیر: تنخواہ جو ملے گی۔

ناصرہ: تنخواہ!۔۔۔ (انداز طنز یہ ہے) تنخواہ پہلے ہی پوری نہیں ہوتی اس پر بیس روپے کا یہ خرچ۔۔۔

صغیر: (سائیکل کی طرف مڑتے ہوئے) ناصرہ! تنخواہ پہلے ہی پوری نہیں ہوتی۔۔۔ بیس روپے اور کم ہو جائیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ بہت

ہو تو میں اگلے ماہ سگریٹ نہیں پیوں گا۔

ناصرہ: (مسکراتے ہوئے) اوہو۔۔۔ بیٹے کے لیے اتنی قربانی۔۔۔؟

صغیر: دس بارہ کا خسارہ تو اس طرح پورا ہو ہی جائے گا۔

کیوں؟ اب تو مسکراتے لگیں۔ بڑی کنجوس ہو۔۔۔ پیار سے

دیکھتا ہے)

ناصرہ: کنجوس نہ ہوتی تو سر پر قرضے کا بوجھ چڑھا رکھا ہوتا۔

صغیر: اچھا بھئی۔۔۔ اب جانے دو دفتر، دیر ہو رہی ہے سائیکل لے کر ڈیوڑھی

کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

اسی کمرے کے سامنے صحن میں صغیر دفتر جانے کے لیے تیار کھڑا

ہے۔ صحن میں بائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ اس کا پرانا سائیکل کھڑا ہے۔

رونی سائیکل کے پیڈل کو گھما رہا ہے۔ ناصرہ صحن میں کھلنے والے باورچی خانے

کے دروازے میں کھڑی ہے۔

رونی: (سائیکل چھوڑ کر باپ کی طرف آتا ہے) ابو۔۔۔ آج کیا تاریخ ہے۔۔۔؟

(صغیر اور ناصرہ ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں)

صغیر: آج پھیںس ہے بیٹے۔

رونی: پہلی تاریخ کب آئے گی۔

صغیر: (جھک کر اسے پیار کرتے ہوئے) چار دن بعد۔

رونی: (خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے گھومنے لگتا ہے) آہا۔۔۔ چار دن

بعد پہلی تاریخ آئے گی۔

ناصرہ: آئے گی تو پھر کیا؟

رونی: ہمارا ہوائی جہاز آئے گا۔

ناصرہ: اوں۔۔۔ (بچہ ٹکڑے ٹکڑے کا منہ دیکھنے لگتا ہے)

صغیر: (اسے ٹوک دیتا ہے) ناصرہ!

تو یہ اتنا لمبا سفر ہے۔

ناصرہ: (کچھ سی جاتی ہے) اچھا کیا! —

صغیر: نذیر بھائی باہر کے ہی ہو رہے — رڈ پورھی کی طرف جانے لگتا ہے۔

ادھیڑ عمر کا آدمی اندر آتا ہے دونوں تپاک سے مصافحہ کرتے ہیں۔  
(سب باتیں کرنے لگتے ہیں۔ احوال پرسی ہوتی ہے۔ بچے اودھم

مچانے لگتے ہیں۔)

— :: —

تانگہ رکنے اور باتوں کی آواز پر ٹھٹک جاتا ہے ناصرہ بھی اس کے قریب  
آ جاتی ہے)

ناصرہ: تانگہ آیا ہے۔

صغیر: ہمارے ہاں کون آئے گا — سامنے والوں کے مہمان آئے ہونگے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ دو تین بچے اور دو عورتیں آگے پیچھے اندر

آتے ہیں — صغیر اور ناصرہ لپک کر ان کے قریب جاتے ہیں،)

صغیر: آپا — صغیر آیا — آپ — السلام علیکم۔ السلام علیکم۔

صغیر: (برقعہ اتارتے ہوئے) وعلیکم السلام — کیا حال ہے۔ ناصرہ  
اچھی ہوتا —

ناصرہ: (سلام کر کے) صغیر آپا — آپ کیسی ہیں — (دوسری خاتون  
سے) بچو تم اچھی ہونا۔

(پھر بچوں کو باری باری ناصرہ اور صغیر پیار کرنے لگتے ہیں۔

رونی کمرے سے نکل آتا ہے — پھوپھی اسے لپٹا کر پیار کرنے  
لگتی ہے۔)

صغیر: اماں کہاں ہیں؟

ناصرہ: اوپر گئی ہیں۔

صغیر: اچھی تو ہیں۔

ناصرہ: تم اپنی کہو آپا — یہاں سب ٹھیک ہیں۔ نذیر بھائی نہیں آئے؟

صغیر: آئے ہیں۔ تانگے سے سامان اتروا رہے ہیں۔

ناصرہ: (چار پائی کھینچ کر لاتی ہے) بیٹھو آپا — بچو تم بھی برقعہ اتارو۔

صغیر: رات بھر کے سفر نے تو چکنا چور کر دیا — ان بچوں نے

ناک میں دم کر رکھا تھا کہ ماموں کے گھر جانا ہے — میں

نے بھی سوچا چلو پھٹیاں ہیں۔ دس پندرہ دن گزار ہی آئیں —

رونی: میں آج ہوائی جہاز ضرور لوں گا۔

ناصرہ: میرا دماغ نہ چاٹ — جا کھیل باہر جا کر۔

رونی باہر جانے لگتا ہے کہ صغیر دروازے میں دکھائی دیتا ہے۔

رونی دوڑ کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے۔

رونی: ابو — آج پہلی تاریخ ہے نا — تنخواہ لائے ہیں نا ابو۔

صغیر: ہاں بیٹے — ہٹو ذرا — باہر کھیلو۔

رونی: اب تیار ہو جاؤں۔

ناصرہ: (جھپٹ کر) کہاں کے لیے؟

رونی: بازار جاؤں گا۔

ناصرہ: کس لیے۔

رونی: ہوائی جہاز لینے۔

صغیر: آں — بیٹا — دیکھو — گھر میں اتنے مہمان آئے ہیں۔ ہوائی

جہاز لینے کے لیے جائیں۔

رونی: (حیرانگی سے) کیوں ابو۔

صغیر: بیٹا اس دفعہ بہت پیسے خرچ ہو گئے ہیں — ہوائی جہاز کہاں سے لائیں۔

(رونی منہ بسورنے لگتا ہے)

ناصرہ: خبردار جو منہ بنایا۔

رونی: (بسورنے ہوئے) ہوائی — جہاز —

صغیر: (اداس سا نظر آتا ہے) بیٹے — اچھے بیٹے بنو نا — (پیار کرتا ہے)

ناصرہ: یہ سمجھ چکا پیار سے۔

صغیر: تم خواہ مخواہ نہ بھلاؤ — ہم اپنے بیٹے کو سمجھالیں گے — ہماری بات

تو مان جائے گا۔ کیوں رونی — اچھے بچے ہونا۔

رونی: (منہ بناتے ہوئے) ابو — ہوائی — جہاز —

(باورچی خانہ — ناصرہ بڑے سے دیگچے میں چاول اُبال رہی ہے)

مٹی کی ہانڈی اُگیٹھی پر رکھی ہے۔ باورچی خانے میں برتن بکھرے پڑے

ہیں۔ باہر سے باتوں اور بچوں کے شور و غل کی آواز آتی ہے۔)

رونی: امی —

ناصرہ: ہوں —

رونی: امی آج پہلی تاریخ ہے نا۔

ناصرہ: (غصے سے جھنجھلا کر) ہاں — ہاں — پہلی تاریخ ہی ہے۔

رونی: آج — آج ابو — تنخواہ — لائیں گے نا —

ناصرہ: (جھٹکا کر) لائیں گے — ضرور لائیں گے۔

رونی: مجھے ہوائی جہاز لے دیں گے نا —

ناصرہ: (غصے سے) ہوائی جہاز نہیں کچھ اور بھی لے دیں گے (اپنے آپ سے)

تنخواہ؟ ہونہ۔ اس بار تو تنخواہ آنے سے پہلے ہی اڑ گئی ہے۔ دس مہمان

سرور آن بیٹھے ہیں۔ پہلے ہی گزارہ شکل سے ہوتا تھا — اب تو —

ایک نہ دو کٹھے دس آدمی۔

رونی: (رماں کے کندھے پر بھول کر) امی۔

ناصرہ: ہٹ جا پرے (چاول کے دیگچے میں چمچ ہلاتی ہے)۔

صغیر: ہاں بیٹے۔

رونی: کب لے کر دیں گے ہوائی جہاز۔

صغیر: اگلی پہلی کو — وعدہ رہا —

رونی: رہا تھ بڑھاکر، پکا وعدہ؟

صغیر: بھئی پکا — بالکل پکا ربحے کا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلاتا ہے۔

(رونی برا سامنے بنا کر باورچی خانے سے نکل جاتا ہے)

صغیر: کتنا بایوس ہوا ہے بیچارہ۔

ناصرہ: آپ کی غلطی ہے۔

صغیر: غلطی کی کیا بات — بچے کی کوئی خواہش پوری کرنا

غلطی ہے؟

ناصرہ: ہم جیسے لوگوں کے بچوں کی کوئی خواہش ہوتی ہی نہیں چاہیے ربا یوس

پھر سے صغیر کو دیکھتی ہے۔) جہاں گزراوقات ہی شکل سے

ہوتی ہو وہاں خواہشوں کا کیا کام؟

صغیر: عجب مشکل ہے — زندگی روز بروز تلخ ہی ہوتی جا رہی ہے۔

اب یہ مہمانوں پر جو خرچہ اٹھے گا وہ کیسے پورا ہوگا — تم ذرا ہاتھ پھینچ

کر خرچ کیا کرو نا —

ناصرہ: رملنی سے ہنس کر) ہاتھ پھینچ کر خرچ؟ ہونہ — کل گوشت

نہیں منگایا۔ تو اماں نے سو باتیں کہیں۔ (اماں کی نقل کا اندازہ) کون سا

روز کوئی کسی کے گھر آتا ہے۔ تین سال بعد میری بیٹی آئی ہے —

اور پھر داماد کا بھی خیال کرو — نذیر کیا کہے گا — پہلے کون

سے مرغ پلاؤ پک رہے ہیں — جو مونا گوشت بھی نہیں منگایا۔

صغیر: اماں پرانے زمانے کی عورت ہیں۔ انہیں کیا پتہ آج کل

کس بھاؤ چلتی ہے — اڑھائی سو روپے میں کیا

صغیر: دیکھنا بیٹا — اتنے مہمان آئے ہیں گھر میں — اوہ — ہاں دیکھو۔

اگر تم آج ہوائی جہاز لے آئے تو پھپھو کے بیٹے راشی — رفو تم

سے چھین لیں گے۔ (پچکار تے ہوئے) سارا ہوائی جہاز توڑ پھوڑ

ڈالیں گے۔

رونی: (آنکھیں پھیل کر) ہاں ابو —

صغیر: دیکھو۔

رونی: جی۔

صغیر: (سرگوشی کے انداز میں) جب یہ سب چلے جائیں گے نا۔ تو پھر

ہم تمہیں ہوائی جہاز لادیں گے۔ یہ سب گندے بچے ہیں۔ تمہارا

جہاز توڑ دیں گے۔

رونی: (مان جاتا ہے) یہ کب جائیں گے ابو۔

(صغیر اور ناصرہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگتے ہیں)

ناصرہ: بس اب زیادہ باتیں مت کرو — کہہ دیا ہے ناجب سب چلے

جائیں گے تو تمہیں لادیں گے ہوائی جہاز (صغیر سے) آپ

کو میں نے اس دن منع بھی کیا تھا۔ جھوٹا وعدہ کرنے سے

کیا فائدہ —؟

صغیر: اب مجھے الہام ہونا تھا کیا۔ کہ مہمان آجائیں گے۔ اور تم خواہ آنے سے

پہلے ہی آدھی ختم ہو جائے گی۔

ناصرہ: آہستہ بولیں نا — کسی نے سن لیا تو برا منائیں گے۔ ابھی تو چار

دن ہی گزرے ہیں — آپا صغیر کا ارادہ دس گیارہ تک یہیں

رہنے کا ہے۔

صغیر: (گرمی آہ بھر کر) اچھا بھئی —

رونی: ابو!

کچھ ہو سکتا ہے۔

ناصرہ: پچاس روپے جو حامد سے آپ لائے تھے۔ خرچ ہو گئے سارے۔۔

دو روپے باقی بچے ہیں۔

صغیر: اچھا—اچھا—کیا ہو سکتا ہے اب—

ناصرہ چادلوں کو دم دے کر چولہا بند کرتی ہے۔ صغیر باورچی خانے سے باہر نکل جاتا ہے،

— ... —

روہی کمرہ— صغیر اور ناصرہ آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ دس دس کے نوٹ صغیر گن رہا ہے۔ کچھ ریزگاری بھی سامنے پڑی ہے —  
صغیر: یہ لو— دو سو چالیس ہیں — (دو روپے روپے کے نوٹ گنتا ہے —)  
یہ آٹھ روپے ہیں اور دو روپے کی یہ ریزگاری ہوگی۔

ناصرہ: پورے اڑھائی سو ہو گئے۔

صغیر: ہاں — کٹ کٹا کر اڑھائی سو ہی تو ملتے ہیں۔

ناصرہ: اس دفعہ تو!

صغیر: (جلدی سے) حساب بعد میں کرنا۔ پہلے بیس روپے مجھے دے دو۔

ناصرہ: کیوں؟

صغیر: روٹی کے ہوائی جہاز کے لیے۔

ناصرہ: (حیرانگی سے) ہائے ہائے — اب کیا کہوں آپ کو — بیس روپے

کہاں پچیں گے۔

صغیر: وہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن روٹی — دوسری بار پہلی تاریخ آگئی

ہے ناصرہ — پورا مہینہ اس نے کتنا صبر آزما

انتظار کیا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ اس دفعہ میں اسے ہوائی جہاز

ضرور لے دوں گا —

ناصرہ: (ہاتھ پر ہاتھ مار کر) اب آپ سمجھیں گے تھوڑا ہی۔

صغیر: تم سمجھانے کی کوشش بھی نہ کرو۔

ناصرہ: پہلے حساب کر لیں۔ کچھ بچا تو بیس روپے کی خرافات بھی کر لیجئے گا۔

صغیر: تم ضروری اخراجات کے پیسے الگ کر لوںا۔ باقی میں سے۔۔۔

ناصرہ: (بات کاٹ کر) ضروری اور غیر ضروری کیا۔۔۔ (نوٹ گن کر) یہ بچا س روپے تو حامد بھائی کے واپس کرنا ہیں۔

صغیر: ادھو۔ مجھے تو یاد ہی نہ رہا تھا۔

ناصرہ: آپ کو ابھی بہت کچھ یاد نہیں ہوگا۔ بنیے کا حساب بھی چکانا ہے۔ آٹا۔ چاول اور گھی اس ماہ ادھار ہی آئے تھے۔

صغیر: ساٹھ ستر تو ہوگا ہی اس کا بل۔

ناصرہ: جی اس سے بھی کچھ زیادہ۔۔۔ چودہ تارتخ صغیرہ آپا گئی ہیں۔ کتنا خستہ ہوا؟

صغیر: (تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کر) ہوں، ہم جیسے محدود آمدنی والے لوگوں کے ہاں تو مہمان آنا ہی نہیں چاہئیں۔۔۔ آہ۔۔۔ کیا زمانہ ہے، بھائی بہنوں کی آمد پر بھی خوشی کی بجائے کوفت ہوتی ہے۔

ناصرہ: مہمان تو آئے سو آئے۔ ہمارے رسم و رواج بھی تو بیہودہ ہیں۔

صغیر: اٹھارہ بیس دن اتنے آدمی اکٹھے ہو جائیں تو۔۔۔

ناصرہ: اماں تو خوش نہیں ہیں؟

صغیر: (چونک کر) کیوں؟

ناصرہ: ان کی مرضی تھی کہ صغیرہ آپا اور بچوں کو کپڑے بھی دیئے جاتے۔۔۔ خالی مٹھائی لا دینے کا کیا؟

صغیر: کپڑے؟

ناصرہ: کہتی تھیں۔۔۔ باپ زندہ ہوتا تو یونہی چلی جاتی میری صغیرہ۔۔۔ باپ اور بھائی میں یہی تو فرق ہے۔

صغیر: ادھو۔۔۔ حد ہوگئی۔ اپنا تو تیا پاچا ہو گیا۔ اور اوپر سے یہ باتیں۔

ناصرہ: میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ خاموشی سے سن لیا سب کچھ۔

صغیر: اچھا ہی کیا۔۔۔

ناصرہ: ہاں تو۔۔۔ حساب کر لیجئے نا؟

صغیر: رہنے ہی دو۔۔۔ اس طرح تو سو بھی نہیں بچے گا۔ ابھی پورا مہینہ گزارنا ہے۔

ناصرہ: اسی لیے تو میں کہہ رہی تھی۔ پندرہ بیس روپی کے لیے کہاں سے بچیں گے۔

صغیر: (کردٹ بدل کر) بڑی بڑی بات ہے۔۔۔ بیمارہ۔۔۔ کتنا مایوس ہوگا۔

ناصرہ: (راہ بھر کر) اس کی مایوسی کو دیکھیں یا اپنے آپ کو۔

صغیر: مجھے تو روپی کا سامنا کرنے سے ڈر لگ رہا ہے۔

ناصرہ: آپ بھی تو خواہ مخواہ اسے سر جڑھا لیتے ہیں۔ روپے دو روپے کی چیز

ہوتی تو کسی نہ کسی طرح خرید بھی دیتے۔ چودہ پندرہ روپے سے کم تو نہیں

ہوگا یہ جہاز۔۔۔

صغیر: ہاں کیا کم ہوگا۔ جاپانی کھلونا ہے۔

ناصرہ: چھوڑیے جی اسے۔

صغیر: اب روپی سے کون لگا کیا؟۔۔۔ وہ تو میری جان کھالے گا۔ پورا مہینہ

انتظار کرتا رہا ہے بیمارہ۔۔۔

ناصرہ: (منہس کر) اگلے مہینے کی پہلی تارتخ تک ٹال دیجئے گا۔

صغیر: اگلی پہلی کو کوئی اور خرچ آن پڑے گا۔

ناصرہ: پھر کیا کیا جائے۔



صغیر: (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) ناصرہ — اگلے ماہ تو رونی کی خواہش بہر طور پوری کرنا ہوگی۔ تنخواہ میں سے سو پچپن یا پچاس میں اپنے بیٹے کو ضرور ہوائی جہاز لادوں گا۔

ناصرہ: (اداس لہجے میں) اچھا جی — واقعی بڑا ترس آتا ہے رونی پر — اگلے مہینے لے دیجئے گا۔ جہنم میں جائیں سارے خرچ — جیسے بھی بن پڑے گا پورے ہو ہی جائیں گے۔

صغیر: (ہنس کر) تم نے رضا مندی ظاہر کر دی۔ تو سمجھو رونی کو کھلونا مل گیا۔ (ناصرہ مسکراتے ہوئے نوٹ اکٹھے کر رہے لگتی ہے)

(روہی کمرہ — ناصرہ رونی کو تیار کرنے کے بعد بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ رونی بے حد خوش نظر آ رہا ہے۔ صغیر اپنا کوٹ برش سے صاف کر رہا ہے۔)

ناصرہ: آخر تمھاری ضد پوری ہو ہی گئی۔

رونی: (خوش دل سے مسکراتے ہوئے) آہا — ہا — آج ہمارا ہوائی جہاز اٹیکا۔

صغیر: (کوٹ پہنتے ہوئے) کتنا خوش ہے میرا بیٹا — چہرہ چمک اٹھا ہے۔

ناصرہ: جی ہاں — باپ بھی خوش بیٹا بھی خوش — خرچ کے لیے پیسے بچیں نہ بچیں۔ ہوائی جہاز آجائے گا۔

صغیر: خرچ کا رونا بس بھی کرو۔ آج تو باپ بیٹے کو خوش ہو لینے تو دو۔ رونے کو مہینہ پڑا ہے۔

ناصرہ: (مسکرا کر) بیچ مانیئے مجھے تو پندرہ روپے کے خیال ہی سے ہول آ رہا ہے۔ باپ بیٹے کی ضد ہے ورنہ ایسی فضول خرچی کی اجازت کبھی نہ دیتی۔

رونی: چلتے نا ابو۔

صغیر: چلتے ہیں بیٹے — آج تو جیب میں مال ہے گھبراؤ نہیں۔ جہاز آج ضرور آئے گا۔ (بالوں میں کنگھی کر کے تیار ہو کر مڑتا ہے)

صغیر: چلو رونی۔

دادی: صبح کہہ رہی ہوں۔ بیٹے کا کھلونا تو اشد ضروری ہے۔ پندرہ بیس روپے اس کے لیے ہیں۔ میری قمیض کے لیے سات آٹھ نہیں ہیں۔  
ناصرہ: یہ بات نہیں اماں۔ روئی تین ماہ سے خد کر رہا ہے۔ پچھلے ماہ مہمان آگئے۔

دادی: مہمان؟ اٹھتے بیٹھتے مہمانوں ہی کا رونا روتی ہو ہو۔ مہمان کیا تھے قیامت تھی۔ میں جیسے اندھی بہری تھی نا۔ دونوں پر جیسے عذاب ٹوٹ پڑا تھا۔ تین سال بعد میری بچی آئی (روہانسی ہو کر) خالی ہاتھ لوٹ گئی۔

صغیر: اماں میں کوئی رئیس تو نہیں ہوں۔ اڑھائی تین سو روپے تنخواہ ہی ہے نا۔

دادی: بس بس۔ رہنے دے جانتی ہوں سب کچھ۔ اپنی اولاد ہو تو۔  
صغیر: اماں!  
ناصرہ: اماں آپ کو کیسے سمجھائیں ہم۔

دادی: اے رہنے دے۔ جیسے میں سمجھتی نہیں۔ بیٹے کے کھلونے کے لیے پندرہ بیس نکل آئے۔ ماں نے قمیض کا نام لیا تو لگے ٹال مٹول کرنے۔ (روئی آواز) میں تو پہلے ہی جھجک رہی تھی۔ ہو بیٹے کا راج اور محتاج کسی نے یونہی تو نہیں کمانا۔

ناصرہ: (غصے سے) جابیئے جی اماں کے کپڑے لے آئے۔ روئی کا کھلونا کوئی ایسا ضروری نہیں۔

روئی: امی! میرا ہوائی جہاز۔ میں آج ضرور لوں گا۔  
دادی: ضرورے بیٹے۔ ضرورے۔ قمیض کے بغیر تو گزر ہو سکتی ہے۔ کھلونے کے بغیر نہیں۔

ناصرہ: (بچے کو اپنی طرف کھینچتی ہے) ادھر آ۔ کوئی ضرورت نہیں کھلونا لینے کی۔

روئی: (اٹھلاتے ہوئے) چلو جی۔ چلو۔  
کرے میں دادی اماں داخل ہوتی ہے۔ وہ کچھڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت ہے۔ معمولی سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔  
دادی: کہا جا رہے ہو بیٹے۔

صغیر: بازار۔  
روئی: دادی اماں۔ میں ہوائی جہاز لاؤں گا۔ چابی لگائی تو یوں گھومنے لگتا ہے (چکر کاٹ کر دکھاتا ہے)۔ ناصرہ اور صغیر مسکرانے لگتے ہیں۔  
صغیر: روئی کئی دنوں سے ہوائی جہاز کے لیے خد کر رہا تھا۔ آج تنخواہ ملی ہے۔ وہ لینے جا رہے ہیں۔

ناصرہ: (ہنس کر) کئی دنوں سے یا کئی مہینوں سے۔  
دادی: بازار جا ہی رہے ہو۔ میرے لیے ایک فلائین کی قمیض اور ملل کا دوپٹہ بھی لیتے آنا۔ سردی کافی اتر آئی ہے۔ ان کپڑوں میں ٹھنڈ محسوس ہوتی ہے۔

(ناصرہ کا چہرہ لٹک جاتا ہے۔ صغیر بھی چپ ہو جاتا ہے۔)

دادی: چھوٹے پھول اور ہلکے رنگ ہوں۔  
صغیر: اماں۔ (جھجک جاتا ہے)

دادی: کیوں؟  
صغیر: قمیض لا دوں گا۔ ابھی تو روئی کا کھلونا لینے جا رہا ہوں۔

ناصرہ: فلائین کی دو قمیضیں ابھی آپ کے پاس ہیں۔ اگلے مہینے لادیں گے۔  
صغیر: ہاں ہاں اگلے مہینے ضرور لادیں گے۔ اس ماہ۔ دراصل اماں۔ اس ماہ پیسے نہیں بچے۔

دادی: (برامان کر) میرے لیے تو تیرے پاس کبھی پیسے بچیں گے ہی نہیں۔  
صغیر: کیا کہہ رہی ہیں اماں۔

صغیر: پریشان ہو کر) ناصرہ — تم جانتی ہو کہ بیچارہ —  
ناصرہ: (غصے سے) کوئی بیچارہ و چارہ نہیں۔

دادی: اب میرے سرمے چڑھ ہو — پندرہ بیس چھوڑ پچاس کا کھلونا لا دو —  
میں تو خواہ مخواہ ہی قیض کا کہہ بیٹھی — (روہا نسی ہو کر) خدا کسی کو محتاج بھی کرے۔  
صغیر: اماں!!

(دادی دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ صغیر پریشان سا کھڑا رہتا ہے۔ ناصرہ بچے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بچہ ہاتھ چھڑا کر باپ کی طرف جاتا ہے۔ باہر سے ماں کے بڑبڑانے، ہسکیاں بھرنے کی آواز آتی ہے۔)

## بھول

(ایک خوبصورتی سے آراستہ کمرہ — کھڑکیوں پر سبز رنگ کے پردے لہرا رہے ہیں۔ فرش پر سرخ قالین ہے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ دو پلنگ ساتھ ساتھ پڑے ہیں۔ جن پر نرم و گداز بستر ہیں۔ بائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ گدے دار کرسیاں اور ایک چکنی سطح کا میز پڑا ہے۔ میز پر گلدان میں تازہ پھول سجے ہیں۔ دیواروں پر خوبصورت فریموں میں جاذب نظر سبزییاں ہیں۔ پلنگ کے ساتھ سائڈ ٹیبل بھی ہیں۔ جن پر مختلف چیزیں رکھی ہیں۔ ایک کونے میں پلنگ کے عین سامنے ٹیلی ویژن سیٹ بھی رکھا ہے۔ ٹرانسٹر میز پر پڑا ہے۔ پلنگ پر پچیس بیس سالہ خوبصورت ثریا لیٹی ہے۔ چہرے سے نقاہت عیاں ہے۔ رنگ زرد اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہیں۔ لباس قیمتی ہے۔ طلائی چوڑیاں ہاتھوں میں ہیں۔ کانوں میں ننھے ننھے آویزے ہیں۔ وہ سوپوں میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ بائیں ہاتھ کے دروازے کا پردہ ہٹتا ہے۔ پانچ سالہ رینو کپڑے کی گدی پر ایک مردار سی بی اٹھائے اندر آتی ہے۔ بچی خاصی پریشان ہے۔ تلی خونا ک آواز میں میاؤں میاؤں کرتی ہے۔)

رونی: ابو — چلیں نا۔ ہوائی جہاز —  
صغیر: (جھٹاکر غصے سے) ہوائی جہاز کا بچہ — دفع ہو جا —  
رونی: (روتے ہوئے) ابو — آج پہلی تاریخ ہے — ہوائی جہاز۔  
ناصرہ: (آنکھوں میں آنسو بھر کر بچے کو سینے سے لگا لیتی ہے) میرے بیٹے —  
صغیر: (کوٹ اتار کر چارپائی پر پھینک کر بڑبڑاتا ہے) اپنی توجان عذاب میں ہی رہتی ہے۔

(رونی رول رول کرنے لگتا ہے۔ ناصرہ آنکھیں پونچھتے ہوئے اسے پچکارنے لگتی ہے۔ صغیر پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگتا ہے۔  
باہر سے ماں کے بڑبڑانے کی ہلکی ہلکی آواز آتی ہے۔)

گی میری بچی — تو دنیا میں اکیلی رہ جائے گی — ادہ — اف —  
 (سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی ہے) مجھے — مجھے کیا ہو رہا ہے —

رینو : امی — امی !

ثریا : رینو — بتا تو — میں مر گئی تو تو کیا کرے گی —

(قدموں کی آواز دروازے سے فاروقی اندر آتا ہے — ثریا  
 بچی سے پوچھ رہی ہے کہ وہ مر گئی تو کیا کرے گی — فاروقی سن

لیتا ہے —)

فاروقی : (قریب آکر) ثریا —

ثریا : (بچی کو چھوڑ دیتی ہے) آپ — جی —

فاروقی : رینو بیٹا —

ثریا : جی ابو —

فاروقی : بیٹا آپ اپنی بلی کو باہر دھوپ میں لٹا دیں —

رینو : ابو یہ بیمار ہے —

فاروقی : ہاں — ہاں — مجھے پتہ ہے — اسی لیے تو کہہ رہا ہوں — اسے دھوپ

میں ڈال دو — ٹھنڈ لگ رہی ہے بیماری کو —

رینو : ابو اسے دوائی لے دیں نا —

فاروقی : شام ڈاکٹر تھاری امی کو دیکھتے آئیں گے نا —

رینو : انکل ریاض —

فاروقی : ہاں — ان سے کہیں گے تمہاری مونا کو ابھی سی دوائی دے دیں —

رینو : آہا — پھر تو مونا بہت جلد ابھی ہو جائے گی نا —

فاروقی : بالکل بالکل — جاؤ اسے دھوپ میں لٹا دو — بیماری کے درد ہو

رہا ہے ٹھنڈ سے — شاباش جاؤ —

رینو : اچھا ابو (بلی کو اٹھائے چل جاتی ہے)

ثریا : (کر دھڑ بدل کر رینو کو دیکھتی ہے پھر ماتھے پر بل ڈال کر) رینو —  
 رینو : (قریب آکر) جی امی —

ثریا : کیوں اٹھائے پھرتی ہے اس مردار کو —

رینو : امی ! میری پیاری بلی ہے یہ (پیار سے بلی کو دیکھتے ہوئے) بیچاری  
 بیمار ہے —

ثریا : اسے ایک طرف ڈال دے — دیکھ نہیں رہی — اس کے منہ سے رال ٹپک  
 رہا ہے — سارا فرک گندہ ہو جائے گا — جا باہر پھینک آ اسے —

رینو : ہائے امی — بیچاری بیمار ہے — باہر کیوں پھینک دوں —

ثریا : یہ مر جائے گی —

رینو : (جلدی سے گھبرا کر) کیوں !

ثریا : بیمار جو ہے —

رینو : (بلی کو فرش پر رکھ کر ماں کے قریب آکر حیرانی سے) بیمار مر جایا کرتے  
 ہیں امی —

ثریا : ہاں !

رینو : (معصومیت سے) آپ بھی مر جائیں گی ؟

ثریا : (زٹ پ کر) رینو —

رینو : امی —

ثریا : (بچی کو بازوؤں میں لے کر) میں مر گئی — تو — تو کیا کرے گی رینو —

رینو : (روہانسی ہو کر) امی —

ثریا : آہ میری بچی —

(رہنمائی خفناک سی میاؤں میاؤں کرتی ہے — رینو دوڑ کر بلی  
 کی طرف جاتی ہے — اسے اٹھا کر ماں کے قریب آجاتی ہے) —

ثریا : (اپنے آپ سے) میں — میں مر گئی — تو — تو — تو کیا کرے

کمزوری ہے۔ وہ بھی ڈیڑھ ماہ بخار رہنے سے ہونا ہی تھی۔

ثریا: بخار کیسا تھا؟

فاروقی: جیسا بھی تھا اب تو اتر چکا۔ ڈاکٹر بے وقوف تو نہیں جو ہمیں اندھیرے میں رکھے۔ اور پھر تم جانتی ہو۔ ریاض صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ مخلص دوست بھی ہے۔ ایسی ویسی بات ہوتی۔ تو وہ مجھ سے کیوں پھپھاتا۔

ثریا: اس لیے کہ وہ تمہارا دوست بھی ہے۔ صرف ڈاکٹر نہیں۔

فاروقی: راجھنجا جاتا ہے قدرے تنگی سے، تمہیں کوئی کیسے سمجھائے؟

ثریا: فاروقی!! (زندھی آواز میں) اگر مجھے کوئی بیماری نہیں۔ تو پھر سینے میں ٹیسس کیوں اٹھتی رہتی ہیں۔ مگر ہر وقت کیوں دکھتی رہتی ہے۔ چہرے کی زردی مٹ کیوں نہیں جاتی۔ گوشت، پوست، سوکھا چمڑہ کیوں بنتا جا رہا ہے۔ سانس الجھنے لگتا ہے (آنکھوں کی چمک عموماً کیوں نہیں کراتی۔ سانس کا توازن کیوں بگڑ جاتا ہے۔ بتاؤ فاروقی بتاؤ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔

فاروقی: (جھٹاکر) یہ سب تمہارے دہم کا کرشمہ ہے۔ جو ٹانگوں کا اثر ہوتا ہے

ناخوراک کا۔ بخار کی کمزوری ہے اور بس۔ کبھی ٹی بی بنا لیتی ہو

کبھی کینسر۔ ڈاکٹر نے ہزار بار کہا ہے دھیان اور طرف لگایا کرو۔

لیکن تم ہو کہ کسی کی سنتی ہی نہیں، کتابیں، رسالے جوں کے توں پڑے ہیں۔

ریڈیو کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ٹی وی دیکھنا ممنوع۔ صبح شام بستر پر لیٹی ہی

سوچتی رہتی ہو کہ خطرناک بیماریاں تمہیں لنگ رہی ہیں۔

ثریا: (ٹھنڈی آہ بھر کر) یہ حقیقت ہے فاروقی۔ میں موت کے سیاوں

کو اپنے اوپر لہراتا دیکھتی ہوں۔ زندگی کا یہ شعلہ ایک دم سرد ہو جائے

گا۔ میں جانتی ہوں۔

فاروقی: رما تھے پر بل ڈال کر خفگی سے، خدا کے لیے کوئی اور بات کرو۔

فاروقی: (ثریا کے قریب پہنچ کر بیٹھتے ہوئے) تم پھر ریو سے وہی فضول باتیں کر رہی تھیں نا۔

ثریا: (دوہمی انداز میں) فاروقی، بتی کل سے بڑی منحوس آوازیں نکال رہی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

فاروقی: تمہارے ان واہوں کا کیا علاج۔

ثریا: یہ واہے نہیں فاروقی۔

فاروقی: خدا کے لیے ثریا۔ ایسی باتیں سوچا کرو۔ نہ کیا کرو۔ پھر ریو سے ایسی باتیں کرنے کا کیا مطلب۔ وہ معصوم تمہاری باتوں کو کیا سمجھے گی۔ خواہ خواہ پریشان ہو جاتی ہے۔ ننھے سے ذہن پر بوجھ۔

ثریا: ربات کاٹ کر اسے آنے والے وقت کے لیے تیار کرتی ہوں فاروقی۔

فاروقی: ثریا!!

ثریا: (دہر خند) میں اپنی بیماری اور اس کی نوعیت سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

فاروقی: ادہ۔ خدا یا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ثریا۔ حد سے زیادہ وہمی ہو

گئی ہو۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے۔ تمہیں کوئی بیماری نہیں۔

بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔

ثریا: ہونہ۔ ٹھیک ٹھاک۔؟

فاروقی: اب اس کا کیا علاج کہ تم ہر بات کا تاریک پہلو ہی دیکھنے لگی ہو۔

ثریا: مجھے پاگل سمجھتے ہو۔

فاروقی: پاگل نہیں۔ وہی!

ثریا: یہ دہم نہیں فاروقی۔

فاروقی: تو اور کیا ہے۔؟

ثریا: ہوں۔ (گہری آہ بھرتی ہے)

فاروقی: تمہارے سارے ایکس رے ٹھیک ہیں۔ تمہیں ٹی بی ہے نہ کینسر صرف

ثریا : کیوں — تنگ آگئے۔

فاروقی : (رہلا کر) واقعی تنگ آگیا ہوں — تمہاری بے سرو پا باتیں سن سن کر کان پک گئے۔

ثریا : (دردناک لہجے میں) فاروقی۔

فاروقی : (اٹھ کر کھڑا ہوجاتا ہے) مجھے کام سے باہر جانا ہے۔

ثریا : (اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیتی ہے)۔ (مجھے بجھے لہجے میں) میں جانتی تھی — تم — تم تنگ آگئے ہو —

فاروقی : رہنس کر اس پر جھکتے ہوئے، لا حول ولا۔ بس اب اسی بات پر کڑھتی رہنا۔  
ثریا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ پاگل تو نہیں ہو گئیں۔

ثریا : (درد بھرے لہجے میں) پاگل — واقعی پاگل ہی ہو گئی ہوں۔

فاروقی : چلو پھوڑوان باتوں کو — (اٹھتے ہوئے) میں ریو کو دیکھوں جا کر۔  
بلی کے سرہانے بیٹھی ہوگی۔

ثریا : (رگہری آہ بھر کر خاموش ہوجاتی ہے)۔

فاروقی : (اس پر جھکتے ہوئے انگلیوں سے اس کے گال چھوتے ہوئے پیار سے)

ثریا — ریو سے خوب پیار کیا کرو — تم تو اپنے آپ سے بیزار رہنے

لگی ہو۔ بچی کا ہوش ہی نہیں۔ اسی لیے تو وہ بلی سے اتنی وابستہ ہو گئی ہے۔

میریل سی بلی ہے۔ لیکن اسے جان سے پیاری ہے۔ تم پیار۔

ثریا : (سر چپتے ہوئے پیار — !!)

فاروقی : (چند لمحے اسے دیکھتا رہتا ہے پھر ملائمت سے) تم کن سوچوں میں ڈوب گئیں۔

ثریا : اُف —

فاروقی : (غصیلے لہجے میں) تم تو اپنی جان کی دشمن ہو ثریا — حد ہو گئی —

پہلے ہی کیا کم دہمی تھیں — بیمار ہو کر تو غضب ہی ہو گیا۔ عقل سے

بھی کچھ سوچا کرو — (میز سے رسالہ اٹھا کر) لو یہ دیکھو — ربات

بدلنے کی غرض سے) ایک خوبصورت افسانہ چھپا ہے اس میں۔ لو اسے پڑھو۔  
طبیعتِ بشاش ہو جائے گی۔

ثریا : (بے دلی سے رسالہ لے لیتی ہے) شاباش — پڑھو اسے۔ ہوں —

اچھا — میں کام سے باہر جا رہا ہوں (رہنس کر) دیر ہو گئی تو گھرانا نہیں

— کوئی نئی سوچ نہ پریشان کرنے لگے تمہیں، سمجھیں (پیار سے اس کی  
ٹھوڈھی ہلا کر کمرے سے نکل جاتا ہے)

ثریا : (اپنے آپ سے) تنگ آگئے — آخر تنگ آگئے نا — میں کئی دنوں

سے محسوس کر رہی تھی — (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) ان میں

بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ بات بات پر جھلا جاتے ہیں۔ پہلے گھنٹوں میرے

پاس بیٹھے رہتے تھے۔ اب — اب میرے پاس آتے ہی انہیں کام

پادا آجاتے ہیں۔ اُف — آہ — فاروقی۔ تم اگر یوں بدل گئے —

تو میں جیتے جی مرجاؤں گی — مرجاؤں گی — مر تو — ہیں —

پہلے ہی رہی ہوں فاروقی۔ (دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے

لگتی ہے —) فاروقی — فار — وقی —

ریاض: شام کو بھیجیں گے۔ تم اس کو اس کی پلنگڑی پر پڑا رہنے دو۔ کان کھول کر سن لو۔ اب تم نے اسے اٹھانا بالکل نہیں سمجھیں۔  
ذرا بھیا ہاتھ لگایا۔ تو دوائی کا اثر نہیں ہوگا۔

ریتو: (حسرت سے بلی کو دیکھتے ہوئے) اچھا چامیاں۔  
ریاض: شاباش! ہاں تو اب اسے باہر دھوپ میں ڈال دو۔  
ریتو: (جھک کر بلی کو اٹھانے لگتی ہے) میری مونا۔  
ریاض: اوں ہوں ہوں۔

ریتو: جی چامیاں۔  
ریاض: تم نے پھر ہاتھ لگایا بلی کو۔  
ریتو: اسے دھوپ میں لٹاؤں گی۔  
ریاض: جاؤ بیٹی مائی کو بلاؤ۔ وہ اسے اٹھا کر لے جائے گی۔  
ریتو: اچھا اب تو۔۔۔ (دور ٹکر کرے سے نکل جاتی ہے)  
ریاض: تو بے۔۔۔ بلی تو ریتو کے اعصاب پر سوار ہے۔  
فاروقی: (ہینزاری سے) ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے۔ صبح و شام اسی کے چکر میں ہے۔

ریاض: بچی کا کیا قصور فاروقی۔ بیماری ماں کے پیار اور توجہ سے قریباً محروم ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بلی سے وابستہ کر لیا ہے۔  
فاروقی: (سگریٹ ایش ٹرے میں بھجائے ہوئے پریشان آواز میں) میں کیا کروں ڈاکٹر۔۔۔ میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔۔۔ ثریا تو بے حد واہمی ہو گئی ہے۔

ریاض: حالانکہ انہیں کوئی بیماری نہیں۔ صرف کمزوری ہے۔  
فاروقی: اسی بات کا اسے یقین آتا ہی نہیں۔ ایکس رے دکھا چکا ہوں میڈیکل رپورٹ پڑھائی ہے۔ لیکن وہ ہیں کہ ان چیزوں پر ایمان لاتی ہی نہیں۔

را راستہ پیرا سٹہ ڈرائنگ روم۔ صوفے پر فاروقی اور اس کا دوست ڈاکٹر ریاض بیٹھے ہیں۔ ریتو خوبصورت فرک میں ملبوس گدی پر نیم مردہ بلی کو لٹائے اندر آتی ہے۔ چہرہ بے حد اداس اور پریشان ہے۔ فاروقی خاموشی سے سگریٹ چھونک رہا ہے)

ریتو: چامیاں۔  
ریاض: ریتو بیٹی پہلے اس بلی کو رکھ دو یہاں (قالین کی طرف اشارہ کرتا ہے)  
ریتو: (جھک کر بلی کی گدی قالین پر رکھتے ہوئے) چامیاں اسے میٹھی سی دوائی دیں نا۔

ریاض: ضرور دیں گے۔ لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا۔  
ریتو: کیا؟

ریاض: بلی کو یوں اٹھائے اٹھائے نہیں پھرو گی۔  
ریتو: (رجیرانگی سے) کیوں؟  
ریاض: بس دوائی جب ملے گی۔  
ریتو: اچھا۔

ریاض: وعدہ کرو۔ پکا پکا وعدہ رہا تھ بڑھا دیتا ہے)  
ریتو: (اس کا ہاتھ پکڑ کر) پکا پکا وعدہ ڈاکٹر چچا۔ اب دوائی دیں نا۔



ریاض: ان کا دھیان اور طرف لگایا کرو۔  
 فاروقی: (دھلا کر) میری کیا ضرورت ریاض — ان کا دماغ خود ہی نئی راہیں  
 نکال لیتا ہے۔

ریاض: ہوں۔  
 فاروقی: آجکل ان کے ذہن پر اک نئی سوتج مسلط ہے۔  
 ریاض: یعنی —

فاروقی: بھئی اس دن میں مذاق میں کہہ بیٹھا کہ تمھاری بے سروپا باتوں سے  
 تنگ آچکا ہوں۔

ریاض: تو!  
 فاروقی: بس یہ بات بلائے جان بنا رکھی ہے۔ میں سامنے رہوں تو دل برداشتہ  
 سی رہتی ہیں۔ سامنے نہ ہوں تو روتی رہتی ہیں۔  
 ریاض: اچھا۔ اچھا — کل میں نے ان کی متورم آنکھوں کو دیکھ کر سوچا تھا۔  
 شاید نئی ٹانگ راس نہیں آئی۔ میں اسے بدلنے کا سوتج رہا تھا —  
 ہوں تو بات یہ تھی۔

فاروقی: کل ساری دوپہر رو کر ہلکان ہوتی رہیں۔  
 ریاض: بُری بات ہے — تمھیں ان کی دل جوئی کرنا چاہیے۔  
 فاروقی: میں ان کی دل شکنی کرتا ہوں کیا؟ تم جانتے ہو ریاض ثریا میرے لیے  
 کیا ہے۔

ریاض: ہوں۔  
 فاروقی: لیکن میرا دماغ تھک گیا ہے۔ ہر وقت مرنے کی باتیں۔ رینو کے  
 مستقبل کی باتیں۔ حد بھی ہوتی ہے کوئی۔  
 ریاض: بیماری نے انداز فکر مایوسانہ کر دیا ہے — کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ  
 ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم دل جوئی کرتے رہا کرو۔

فاروقی: ہر بات کا منفی پہلو دیکھیں گی — رینو کو لپٹا کر روتی رہیں گی راس سے  
 پوچھیں گی۔ کہ میرے مرنے کے بعد تم کیا کرو گی — کل کہہ رہی تھیں۔  
 ماں کی محبت کے ساتھ باپ کی محبت سے بھی محروم ہو جائیں گی رینو —  
 پھر گھنٹہ بھر روتی رہیں — اب یہی سوچتی رہتی ہے کہ میں بدل رہا  
 ہوں ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ ان کے بعد رینو کو بھی بھول جاؤں گا —  
 ڈاکٹر میں بیچ پریشان ہو جاتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔  
 رینو مائی کے ساتھ اندر آتی ہے۔ فاروقی سگریٹ سلگنا لیتا ہے  
 ڈاکٹر رینو کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

ریاض: مائی — رینو کی مونا کو آرام سے پنگڑی پر ڈال دو۔  
 مائی: اچھا صاحب جی (دھک کر بلی کو اٹھاتی ہے)۔  
 ریاض: اور ہاں دیکھو — شام کو ہم اس کے لیے دوائی بھیجیں گے۔  
 تم خود اسے دوائی دینا۔ رینو نے اسے ہاتھ لگایا۔ تو بلی مرجائے گی۔  
 رینو: (جلدی سے) نہیں لگاؤں گی چچا میاں۔  
 فاروقی: مائی — بلی کو باہر لے جاؤ اور رینو کے ہاتھ منہ دھلا دو۔

مائی: بہت اچھا صاحب جی (باہر چل دیتی ہے۔ پیچھے پیچھے رینو بھی جاتی ہے)  
 فاروقی: (صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں انگڑائی لیتا ہے)  
 ریاض: تیمارداری کرتے کرتے کہیں خود نہ بیمار ہو جانا۔  
 فاروقی: گلتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔

ریاض: (ہوں) — سوچنے لگتا ہے)  
 فاروقی: جب سے ثریا بیمار ہوئی ہے۔ میں گھر ہی میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ کاروبار  
 متاثر ہو رہا ہے۔ ثریا کچھ سنبھال لیں۔ تو کام کاج کو بھی دیکھوں لیکن ان  
 کے داہمے میری پریشانی کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔  
 ریاض: (سوچتے ہوئے) ہوں۔



فاروقی: ثریا تو ثریا — رینو کی وجہ سے بھی پریشان ہوں۔ اس کم بخت بلی کو چھوڑتی ہی نہیں۔

ریاض: اٹھو اگر باہر پھینکو ادوا سے۔

فاروقی: توبہ! توبہ! مجھے بچی کی جان سے ہاتھ دھونا ہیں کیا۔

ریاض: یہ بھی سچ کہتے ہو — رینو بیٹا رو رو کر ہلکان ہو جائے ایسی صورت ہیں۔

فاروقی: وہ بھی کچھ ایسی سخت جان ہے کم بخت۔ مرقی بھی نہیں۔

ریاض: مرگئی — تو اور مصیبت — رینو کیا کرے گی۔

فاروقی: مرجائے تو خود ہی صبر آجائے گا رینو کو۔

ریاض: ہاں ٹھیک کہتے ہو۔

فاروقی: (صبراً مسکرا کر) کتنا تو سب ٹھیک ہوں — لیکن بات بنتی کوئی بھی نہیں۔

رملازم چائے کی ٹرے لے کر آجانا ہے — دونوں باتیں کرتے

ہوئے چائے پینے لگ جاتے ہیں۔

ثریا کا کمرہ — برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کے سامنے گدے دار کرسی پر ثریا نیم دراز ہے۔ ریشمی لباس زیب تن ہے۔ لیکن چہرے پر حسب معمول مردنی چھائی ہے۔ ڈاکٹر ریاض دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھا ہے۔ فاروقی مضطربانہ کمرے میں ٹہکتے ہوئے سگریٹ پھونک رہا ہے۔

ثریا: (ہاتھ سے سینہ دباتے ہوئے پڑمردہ آواز میں) ڈاکٹر صاحب —

یہ میرا دم نہیں — جب یہاں ہاتھ لگاتی ہوں تو درد محسوس ہوتا ہے۔

اٹھ کر چلتی ہوں — تو درد شدت اختیار کر جاتا ہے۔

ریاض: (مسکرا کر) بھالی! اگر آپ یہ سب دہمے دل سے نکال دیں۔ تو چند دنوں

میں اپنی پہلی سی حالت پر آجائیں گی۔

ثریا: واہمے — واہمے — آپ نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا

ہے۔ فاروقی بھی ہر وقت یہی سبق دہراتے رہتے ہیں۔ میری تکلیف

کا احساس ہی نہیں (آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہے)

فاروقی: ہونہ — دیکھ لیا ریاض —

ریاض: (راٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) آپ وٹامن دیتے جاؤں۔ ان وسوسوں کے

لیے بھی گولیاں دی ہیں میں نے — فکر کی بات نہیں۔

(ثریا روتی ہے — فاروقی بے چینی سے ٹہکتا ہے)

ریاض: آؤ فاروقی — ریٹھتو سکوپ ہاتھ میں ہلاتے ہوئے) میں تمہیں دوسری  
گولیاں دوں گا — یقیناً بھابی کو ان سے افادہ ہوگا۔

ثریا: (آنسو پونچھتے ہوئے) افادہ تو اب قبر ہی میں ہوگا۔  
ریاض: (جلدی سے) بھابھی — آپ تو زیادتی کر رہی ہیں۔ اتنی مایوسی۔  
فاروقی: رہجے میں جھنجھلاہٹ) میرے تو کان پک گئے ہیں ایسی باتیں سناتے ہوئے  
ریاض۔

ثریا: (رو کر) فاروقی —  
ریاض: کوئی بات نہیں — کوئی بات نہیں — چلو فاروقی میں تمہیں دوائی  
دیتا ہوں۔

(دونوں کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ باہر سے بلی کی دردناک میاؤں  
میاؤں سنائی دیتی ہے — ثریا دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتی ہے)

— ... —

فاروقی اور ڈاکٹر ریاض ثریا کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتے  
ہیں۔ بلی کی کرب ناک آواز پر فاروقی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ برآمدے  
کے دوسرے سرے پر بلی کی پلنگٹھی ہے۔ رینو اس کے قریب کھڑی  
اسے بچکار رہی ہے۔)

فاروقی: کتنی منحوس آواز ہے کم بخت کی۔  
ریاض: (ہنس کر) تم بھی وہم کرنے لگے۔  
فاروقی: نہیں تو —

ریاض: پھر آواز کو منحوس کیوں کر کہہ دیا۔  
فاروقی: منحوس نہیں تو اور کیا ہے ریاض — ثریا بھی تو سن رہی ہوگی۔ جانے  
کیا کیا دوسو سے اس کے ذہن میں جنم لینے لگیں گے۔ مرقی بھی نہیں کم بخت  
یہ بلی۔

ریاض: (ہنس کر) مار ڈالو۔

فاروقی: کیوں کر۔

ریاض: دو بوند زہر دے دو۔

فاروقی: (خوش ہو کر) یہ ٹھیک کہا تم نے —

ریاض: ایک طرف سے تو چھٹی ملے گی تمہیں۔

فاروقی: ریاض تم میری ذہنی پریشانیوں کا انداز نہیں کر سکتے۔ میرے ہنستے بے گھر کو خدا جانے کسی نظر لگ گئی۔

ریاض: (ہنس کر) پھر وہی تو ہم پرستی۔

فاروقی: (گہری سانس بھر کر) میری جگہ تم ہوتے تو یقیناً پاگل ہو جاتے۔

ریاض: رہتے ہوئے یقیناً۔۔۔ یقیناً۔۔۔ (فاروقی کے کندھے کو تھپ تھپاتے ہوئے) تھپاتے ہوئے (توصلہ نہیں ہارو میرے دوست۔۔۔ عام عورتیں وہی ہوتی ہیں۔

فاروقی: اتنی نہیں جتنی ثریا ہے۔

ریاض: بیماری سے چڑچڑی ہو گئی ہیں اور کچھ نہیں۔۔۔ پڑھی لکھی عورت ہیں۔ سب کچھ سمجھتی ہیں۔

فاروقی: چھوڑو یار۔۔۔ وہی تودہ شروع ہی سے ہیں۔۔۔ رجھلاٹے ہوئے

(انداز میں) دیوار پر گواہوں رہا ہے۔۔۔ مہمان آئیں گے۔ کالی بلی راستہ کاٹ گئی۔ آفت آئے گی۔ آنکھ پھڑک رہی ہے۔ مصیبت کا سامنا ہوگا۔

ریاض: حیرت کی بات ہے۔ پڑھی لکھی خاتون اور اتنی تو ہم پرست۔

فاروقی: اب تو معاملہ حد سے باہر ہو گیا ہے۔

ریاض: چلو بلی کا معاملہ تو طے کرتے ہیں۔ آج شام میں دوائی لے آؤں گا رہنما ہے۔ (دوبوند بس کام تمام۔ صرف ریو کا فکر ہے۔

فاروقی: مری ہوئی کو دیکھنے کی تو صبر آجائے گا۔ بہلاؤں گا اسے۔ اس کم بہت بلی کی شکل بھی آسان ہو جائے گی۔ دیکھ کر کراہت آتی ہے۔ پیٹ پھول گیا ہے۔

منہ سے رال ٹپکتا رہتا ہے۔ خوفناک آوازیں نکالتی ہے۔

ریاض: ہاں بیماری خدا جانے کتنی تکلیف میں ہے۔

فاروقی: آواز نہیں سن رہے۔ جیسے رو رہی ہے۔

(ریو دونوں کو دیکھ کر بھاگ کر ادھر آتی ہے)

ریو: چچا میاں۔

ریاض: (جھک کر اسے پیار کرتے ہوئے) کیا بے بیٹا۔

ریو: وہ مونا۔۔۔ مونا (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) مونا رو رہی ہے۔

ریاض: تم نے اسے ہاتھ لگایا ہوگا۔

ریو: نہیں چچا میاں میں نے اسے چھوا بھی نہیں۔

ریاض: اچھا۔

فاروقی: وہ بہت بیمار ہے ریو۔۔۔ اسے چھوڑو۔۔۔ ہم تمہارے لیے اتنی موٹی۔ سفید بلی لائیں گے۔

ریاض: ہاں ہاں فاروقی۔۔۔ بے بس سفید سفید بالوں والی خوبصورت بلی لا دینا ہماری بیٹی کو۔

فاروقی: ضرور۔۔۔ ضرور لا دیں گے۔

ریاض: (ریو سے) اسے باہر پھینک دیں۔

ریو: (ترپ کر) نہیں چچا میاں۔ میری مونا۔۔۔ میری مونا (بھاگ کر بلی کے پاس چلی جاتی ہے)

ریاض: بس دوبوند دینا ہی ٹھیک رہے گا۔

فاروقی: میں تو پہلے ہی کہہ چکا۔ ریو مری ہوئی بلی کو دیکھے گی۔ تو صبر آجائے گا۔

خند کرے گی بھی تو اور چیزوں سے بہلاؤں گا۔۔۔ کوشش کروں گا۔

کہیں سے دوسری بلی مل جائے۔

ریاض: آؤ پھر۔۔۔ دوائی کے ساتھ اس کے لیے زہر بھی لینے آنا۔۔۔ میرے پاس ہے۔

پاس ہے۔

فاروقی: چلو۔

(دونوں چل دیتے ہیں۔)

ریاض: عجیب آدمی ہو۔ بچی ہی ہے نا۔۔۔ روئے دھوئے گی۔ پھر خود  
 ہی صبر آجائے گا۔۔۔ نئی لادینا۔۔۔ خوش ہو جائے گی۔  
 فاروقی: ٹھیک! اچھا آؤ تمہیں چھوڑ آؤں۔ اگر یہ سفاکانہ فعل انجام دوں گا۔  
 ردو لوں ہنستے ہیں۔ ثریا کا سر جھکرا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے  
 سر تھام لیتی ہے۔ آوازیں دور ہوتی جاتی ہیں۔ ثریا بے دم ہو کر  
 تکیے پر گر جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سر اٹھاتی ہے۔ اس کے چہرے سے  
 وحشت ٹپکتی ہے۔

ثریا: (اپنے آپ سے۔۔۔ جیسے خواب میں باتیں کر رہی ہے) میں نے۔۔۔  
 کیا سنا؟۔۔۔ فاروقی۔۔۔ مجھ سے اتنا بیزار۔۔۔ کہ زہر دے کر۔۔۔  
 ختم کرنے پر اتر آئے۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ فاروقی ایسا نہیں کر  
 سکتا وہ مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے۔۔۔ میں اپنے وجود سے انکار کر  
 سکتی ہوں۔ خدا کی خدائی سے منکر ہو سکتی ہوں۔ لیکن فاروقی کی محبت  
 میں زیادہ فریب؛ یہ باور نہیں کر سکتی (سر تھام لیتی ہے) لیکن۔۔۔  
 میں نے اپنے کانوں سے جو سنا۔۔۔ اسے کیسے جھٹلا دوں۔۔۔  
 سیال آگ کانوں میں ٹپکتی ہے۔ زہر۔۔۔ دو بوند۔۔۔ خاتمہ اُف اللہ  
 (چینختی ہے) اتنا اندھیر۔۔۔ ایسا ظلم۔۔۔ فاروقی یوں مجھ سے تنگ  
 آجائے گا۔۔۔ ہنگامہ تو آہی چکا ہے۔۔۔ (دو دہائی آوازیں) میں  
 کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔۔۔ فاروقی میں تبدیلی آرہی تھی۔  
 بات بات پر جھلا ہٹ۔۔۔ کبھی ریوڑ پر غصہ۔ کبھی منحوس بلتی پر۔  
 میں۔۔۔ اپنے آپ کو فریب دیتی رہی۔ دھوکے میں رکھا اپنے آپ کو  
 ۔۔۔ درتہ۔۔۔ فاروقی بالکل بدل چکا ہے۔۔۔ آہ۔۔۔ (بستر پر  
 گر جاتی ہے) ہانپتے ہوئے) کاش مجھے موت آگئی ہوتی۔۔۔ فاروقی  
 ۔۔۔ فاروقی۔۔۔ (بے اختیار ہو کر رونے لگتی ہے)۔۔۔ روتی

(ثریا کا کمرہ۔۔۔ پلنگ کے تکیہ کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھی ہے  
 انگلی کا ناخن دانتوں سے کاٹتے سوچوں میں گم ہے۔ باہر سے فاروقی اور  
 ریاض کی باتوں کی آواز آتی ہے۔ ثریا پہلے تو متوجہ نہیں ہوتی۔ پھر چونک  
 جاتی ہے۔ اور کھڑکی کے قریب ہو کر سننے لگتی ہے۔)

ریاض کی آواز: کیا کیا اس زہر کا؟  
 فاروقی کی آواز: دینے کا حوصلہ نہیں پڑا۔ شیشی جوں کی توں کتابوں کے سیٹ پر  
 رکھی ہے۔

ریاض: بزدل کہیں کے۔۔۔ یوں لگتا ہے۔۔۔ ابھی تم پوری طرح تنگ نہیں آئے۔  
 فاروقی: تنگ؟ خدا کی قسم اس قدر تنگ آچکا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔  
 ریاض: تو پھر دو بوند دے کر ختم کیوں نہیں کر دیتے۔۔۔ دو بوند حلق میں گئے اور  
 کام تمام ہوا۔

فاروقی: گناہ سے ڈرتا ہوں۔ کسی کی زندگی ختم کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ (رہنسنے  
 کی آواز)

ریاض: گناہ اور ثواب کے چکر میں پڑ گئے۔ تو کر چکے یہ کام۔۔۔ اپنے آپ تو ابھی  
 مرنے سے رہی۔

فاروقی: ریوڑ کا بھی خیال آتا ہے۔ وہ کیا کرے گی؟

ہے — پھر اک عزم سے سراٹھاتی ہے — میں — میں خود  
 ہی تمہارے راتے سے ہٹ جاؤں گی — دو بوند زہر اپنے حلق میں  
 خود ہی پیکالوں گی — (ہا پنتے ہوئے) تم گناہ و ثواب کے چکر میں نہ پڑو۔  
 فاروقی! تم بزدل ہو — تو — میں بہادری سے یہ قربانی دے دوں گی۔  
 میں نے اپنی روح کی تمام تر قوتوں سے تمہیں پیار کیا ہے فاروقی —  
 میں تمہیں خوش دیکھنے کی ہمیشہ متمنی رہی ہوں — میں — میں بہ زہر  
 — اپنے حلق میں پیکا کر — ہمیشہ کے لیے تمہارے راتے سے  
 ہٹ جاؤں گی — تمہارا دامن — خوشیوں سے بھر دوں گی —  
 تم خوش رہو — تم — خوش — رہو — تم — خوش —  
 رہو — بستر سے اٹھتی ہے — لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے  
 کمرے سے نکل جاتی ہے — چند لمحوں بعد واپس آتی ہے — اس کے ہاتھ  
 میں زہر کی شیشی ہے — ثریا کی حالت پاگلوں کی سی ہے — شیشی کو دیکھتے  
 ہوئے — لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے پلنگ تک پہنچ جاتی ہے —  
 (شیشی دیکھتے ہوئے) دو بوند — صرف دو بوند — اور سارے دکھ  
 درد مٹ جائیں گے — فاروقی کا راتہ صاف ہو جائے گا۔  
 رینیو کمرے میں آتی ہے — پلنگ کمرے کی طرف بڑھتی ہے)  
 رینیو: امی — امی — امی — امی — امی —  
 ثریا: (چھٹ کر اسے بازوؤں میں دبوچ لیتی ہے) — میری بچی —  
 میری جان — میری روح —  
 رینیو: امی — امی —  
 ثریا: (اسے پلنگ پر کھینچ لیتی ہے) — ثریا کے چہرے سے وحشت ٹپک  
 رہی ہے — بچی کو سینے سے لگائے دیوانہ وار پیار کرتی ہے — رینیو گھبرا جاتی  
 ہے)

رینیو: امی!!  
 ثریا: میری بچی — (رونے لگتی ہے) میری محسوم روح۔  
 رینیو: امی! آپ کیوں روتی ہیں —  
 ثریا: (اسے بازوؤں میں سیٹھتے ہوئے) میری بچی — تو کیا سمجھے کہ میں کیوں رو  
 رہی ہوں — مجھے — کچھ پتہ نہیں — تو ابھی نادان ہے — لیکن جب  
 — تو بڑی ہوگی — تو جان لے گی — کہ تیری بد نصیب ماں کیوں روتی  
 تھی — تو کوئے کھدروں میں چھپ چھپ کر رو دیا کرے گی میری رینیو —  
 ماں کے پیار کو ترس جائے گی — کوئی تیرے سر پر شفقت سے ہاتھ نہیں رکھے  
 گا — کوئی نہیں — کوئی نہیں رکھے گا — زمانے کی ٹھوکریں تیرا مقدر  
 بن جائیں گی — اندھیرے تیری زندگی کی روشنی کو نکل جائیں گے —  
 رینیو رونے لگتی ہے) امی — امی — امی — امی —  
 ثریا: تو تنہا ہوگی — بالکل تنہا — باپ کی شفقتوں سے محروم —  
 باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم — پھر تو کیا کرے گی — میری بچی —  
 رینیو: آپ — کیا کہہ رہی ہیں امی — ابو کہاں ہیں —؟  
 ثریا: ابو — تیرا ابو — زندہ ہے — سفاک ہے سنگ دل ہے۔  
 رینیو: (کچھ نہیں سمجھ پاتی) امی —  
 ثریا: وہ آدمی جو میرا نہ بن سکا — تیرا کیسے بنے گا رینیو۔  
 رینیو: جی! —  
 ثریا: (زہر خند) میری باتیں تو نہیں سمجھ سکتی — نہیں سمجھ سکتی میری جان۔  
 تو محسوم ہے، بچی ہے ابھی — (کچھ سوچنے لگتی ہے) — پھر  
 آہستہ آہستہ شیشی اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے — خوفناک تاثرات چہرے سے  
 مترشح ہیں)  
 رینیو: (شیشی ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے) یہ کیا ہے امی۔

ثریا : منہ کھول ریو — میں یہ آب حیات تیرے حلق میں ٹپکا دوں۔ اپنے ہاتھوں تجھے ختم کر ڈالوں۔ زمانے کے سارے دکھوں سے تجھے نجات دلا دوں — کھول منہ —

ریو : میں دوائی — نہیں کھاؤں گی — رہا تھ سے شیشی پر سے ہٹاتی ہے (رغضب ناک اور وحشت زدہ نظر آتی ہے) کھولو منہ — کھولو —

ریو : (دانت بھینچ کر) نہیں — نہیں — (رہا تھ پاؤں مارتی ہے) —

ثریا : (دیوانگی کے عالم میں چیختے ہوئے) کھول دے منہ ریو — کھول دے —

جلدی کر کھول — کھول — کھو — ل — بھی —

ریو : (چیختے ہوئے) نہیں — نہ — ہیں — امی —

(راچانک فاروقی کمرے میں آ جاتا ہے — پک کر ثریا کی طرف آتا ہے۔)

فاروقی : یہ کیا ہو رہا ہے —؟ ثریا —

ریو : امی — امی دوائی — اب امی دوائی (رہا ہیتی ہے)

فاروقی : ثریا کیا کر رہی ہو بچی کو ثریا کے بازوؤں سے لینے کی کوشش کرتا ہے۔

ثریا : (رغضب ناک ہو کر) تم — تم آگئے — ہٹ جاؤ — پھوڑو ریو

کو — انے نخس ہاتھوں سے اسے مت چھوڑو۔

فاروقی : (ششدر ہو کر) ثریا !!

ثریا : مجھے مت بلاؤ۔

فاروقی : تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ آنکھیں سرخ

النگارہ ہو رہی ہیں — اور — یہ ریو کو دلو چ کیوں رکھا ہے۔ پھوڑو

بچی کو — پھوڑو — پھوڑو —

ثریا : (ریو کو بھینچتے ہوئے) ہٹ جاؤ فاروقی۔ شعلوں کو چھیڑا تو خود جل جاؤ گی۔

فاروقی : (چیخ کر) ثریا !! کیا ہو رہا ہے تمہیں — پاگل دکھائی دے رہی ہو —

(اس کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے) ہوش میں ہو یا —

ثریا : یہ؟ — یہ؟ (تمتہ لگاتی ہے)

ریو : دوائی ہے امی۔

ثریا : ہاں — دوائی — ہر دکھ درد سے نجات دینے والی دوائی۔ تیرے ابو

کی پریشانیوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی دوائی — ان کے رشتے

کی ہر کاوٹ دور کر دینے والی دوائی — رہنستی ہے — لیکن آنکھوں

میں آنسو چھلک جاتے ہیں۔

ریو : امی !

ثریا : میرے سارے روگ ختم کر دے گی یہ دوائی — کچھ سوچ کر۔ میں۔ میں۔

تجھے — تجھے بھی کیوں نہ —

ریو : کیا امی —

ثریا : زلمے کی ٹھوکریں — شفقت و محبت سے محرومی — چھپ چھپ

کر رونا — نہیں نہیں ریو — میں تجھے چھوڑ کر نہیں مر سکتی — تجھے

بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ساتھ — (شیشی کو دیکھتے ہوئے کانپتی

آواز میں کہے جاتی ہے) ساتھ لے جاؤں گی اپنے ساتھ۔

ریو : (متعجب) کہاں امی۔

ثریا : دور ریو۔ بہت دور — جہاں درد سے نہیں بے جاں ابلیسا نہ تو تیں بیکار

ہوتی ہیں۔ جہاں ابدی سکون ملتا ہے (چیخ کر روتے ہوئے) جہاں

بیویوں کو زہر دے کر چھٹکارا حاصل نہیں کیا جاتا — چلو گی نامیرے ساتھ۔

ریو : (ماں سے لپٹ کر) ہاں امی۔

ثریا : (سینے سے بھینچ کر پیار کرتی ہے) شاباش میری بچی — یہ دو بونڈیں۔

حلق میں آنا کر سب مصیبتوں سے چھٹکارا پالیں گے ہم — (گود میں لٹا

کر ریو کا سر بازو پر لٹکا لیتی ہے) ریو —

ریو : جی امی۔

ثریا کے ہاتھ میں زہر کی شیشی دیکھ لیتا ہے۔ رنگ نئی ہو جاتا ہے۔  
ہاتھ پاؤں لرزنے لگتے ہیں۔ گھبراہٹ سے آواز بھی نہیں نکلتی۔ مشکل کہہ  
جاتا ہے ”ثریا“۔

ثریا: (کھٹکھٹا کر ہنس پڑتی ہے) یہ شیشی دیکھ کر گھبرا کیوں گئے؟  
فاروقی: یہ۔ یہ۔ کہیں ریو۔ کہاں سے لی تھی شیشی۔ اُف۔  
ثریا: رہنستی ہے۔ بالکل پاگلوں کی طرح، راز افشا ہو گیا۔! اوہو۔ گھبراؤ  
نہیں۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ ہم ماں بیٹی چپ چاپ تمھاری راہ سے  
ہٹ جائیں گی۔ تمہیں قاتل کوئی نہیں کہے گا۔  
فاروقی: (سرتھام کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے) کیا کہہ رہی ہو ثریا۔

ثریا: وہی جو تم سننا نہیں چاہتے۔ لیکن۔ میں نے تمھاری اور  
ریاض کی باتیں سن لی ہیں۔ ساری سازش کا پتہ چل گیا۔ یہ زہر۔  
دو بونڈیں دے کر تم مجھے ختم کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ میں خود ریو۔  
ریشمی کھول کر ریو کی طرف لے جاتی ہے۔ جھپٹ کر فاروقی شیشی پر سے  
پھینک دیتا ہے۔ شیشی ٹوٹ جاتی ہے۔ ہانپتے ہوئے وہ ثریا کے کندھے  
جھنجھوڑا دیتا ہے۔ ثریا چیختی ہے)

فاروقی: (چیختے ہوئے) ثریا۔ تم۔ کتنی ظالم ہو۔ (ہانپتے ہوئے)  
یا خدا۔ میں اگر آنے جاتا۔ تو۔ تو۔ (رچی کو  
چھین کر گلے سے لگا لیتا ہے)

ثریا: تم۔ تم۔  
فاروقی: (رچی کو سینے سے لگائے لگائے) یہ زہر تو ریاض نے ہی کے  
لیے دیا تھا ثریا۔ تم۔ تم۔ کب کرنے والی تھیں۔  
دکانپتے ہوئے، میرے مولا۔ اُف۔ میں ذرا دیر سے  
آتا۔ تو کیا سے کیا ہو جاتا۔

ثریا: (دھکلاتے ہوئے) زہر۔ بلی۔ بلی۔ کے۔  
لیے۔

فاروقی: (روہانسی آواز میں) تو اور کس کے لیے تھا ثریا۔ تم کتنی  
وہمی ہو۔ میں ذرا دیر سے آتا۔ تو یہ وہم مجھے لے ڈوبتا  
۔ تمھاری بھول مجھے تباہ و برباد کر دیتی۔ آہ۔ میری  
پیاری بچی۔ (ریو کو پیار کرتا ہے) والہا نہ پیار۔  
ثریا حیرت زدہ سی ہے۔

ثریا: (جیسے خواب سے چونک جائے) فاروقی۔ سچ کہہ رہے ہو۔  
زہر بلی کے لیے تھا۔

فاروقی: (رچی کو تڑپ تڑپ کر پیار کرتے ہوئے) ثریا۔ مجھے اتنا  
ذلیل سمجھتی ہو۔

ثریا: (فاروقی کی پُرسوز آواز اور رقت بھرے لہجے سے تڑپ  
کر) اُف۔ شکر ہے۔ تم۔ آگئے۔  
ورنہ۔ ورنہ۔ اُف۔ میرا سر چکرا رہا ہے فاروقی۔  
مجھے معاف کر دو۔ مجھے۔ معاف کر دو۔  
مجھے۔ معاف۔ ف۔ کر۔ دو۔ فاروقی  
۔ فا۔ روقی۔

(ثریا تپورا جباتی ہے۔ فاروقی اسے بازوؤں میں  
لے لیتا ہے۔ ریو پلنگ پر بیٹھی بے ہوش ثریا کو ایک دم  
دیکھتی ہے۔)

ریو: (رماں پر جھکتے ہوئے) اُو، امی کو کیا ہو رہا ہے۔  
فاروقی: (گھبرائے ہوئے لہجے میں) ابے ہوش ہو گئی ہیں۔ دوڑ کر جاؤ بیٹا  
مائی سے کہو ایک گلاس پانی لے آئے۔

(رینو پلنگ سے کوہ کر بھاگتی ہے)  
 فاروقی: رہے ہوش ثریا کو پلنگ پر لٹاتے ہوئے اس پر جھک جاتا ہے (ثریا  
 — تم کتنی خطرناک ہو — میں — ذرا — دیر سے آتا —  
 تو — تو — تمہاری بھول — کتنی خوبصورت صورت اختیار  
 کر جاتی — توبہ یا میرے مولا — توبہ —  
 (فاروقی ثریا پر جھکے جھکے توبہ — اُف اللہ توبہ کہے جاتا ہے ثریا۔  
 گہرے گہرے سانس لیتے بے خبر پڑی ہے)

## تلخیاں

(متوسط گھرانے کا ایک کمرہ — ایک طرف دو پلنگ ساتھ ساتھ پڑے  
 ہیں۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ڈرائنگ ٹیبل رکھا ہے۔ دائیں ہاتھ  
 دیوار پر کھونٹی ہے۔ جس پر خالدہ اور سلیم کے رات کے لباس ٹنگے ہیں کھڑکیوں  
 اور دروازوں پر سنے پر دے ہیں۔ پلنگ پر بھی نیا بیڈ کور ہے۔ فرش پر رنگدار  
 دری سجھی ہے۔ دروازے کے قریب بائیں ہاتھ دو کرسیاں رکھی ہیں۔ جن  
 پر سائن کے کش ہیں۔ دیواروں پر دو ایک تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ خالدہ  
 کی شادی کو تین چار ماہ ہی ہوئے ہیں۔ اس لیے مہرے کی ہر چیز میں نیا  
 پن ہے خالدہ انیس بیس سالہ خوبصورت سی لڑکی ہے۔ پلنگ کی پٹی پر پاؤں  
 لٹکائے بیٹھی ہے — ریشمی دوپٹے سے بار بار آنسو پونچھ رہی ہے۔  
 سامنے تپائی پر ایک کھلا خط پڑا ہے۔ خالدہ خط پھاڑ کر پڑھنے لگتی ہے۔  
 آنکھوں سے آنسو پھر ڈھلکنے لگتے ہیں — ریشمی فیروز سی دوپٹے سے وہ  
 اپنی آنکھیں پونچھنے لگتی ہے۔ سامنے دروازے سے خالدہ کی سانس اندر  
 داخل ہوتی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کی بھاری بھر کم عورت ہے۔ خالدہ کو  
 دیکھتے ہی گھبرا جاتی ہے۔)



سی عورت ہے۔ بہو کو رونے دیکھ کر سینے پر ہاتھ مارتی ہے)  
ملازمہ: کیا ہوا بیگم جی۔ کیوں رورہی ہیں۔ ہو بیگم۔

ساس: ان کی اماں بیمار ہیں۔ خط آیا ہے۔

ملازمہ: رمر پکڑ کر در پر بیٹھتے ہوئے، یا میرے مولا۔۔۔ خیر کیمبو۔۔۔ بال  
بھی نہ دکھنے میری بہو جی کی اماں کا۔۔۔ کتنی اچھی عورت ہیں۔ انہیں  
تو خدا کچھ بھی نہ کرے۔۔۔ اے بی بی روتی کیوں ہو۔۔۔ خدا سے دعا  
مانگو ماں کی زندگی مانگو۔۔۔

ساس: (پیارے خالہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) بس بہو۔۔۔ چپ کرو۔  
یوں تو رو رو کر ہلکان ہو جاؤ گی۔ اٹھو ہاتھ منہ دھو لو۔ اور یہ کپڑے بھی  
بدل ڈالو۔۔۔ یوں گھبرانے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ میرے خیال  
میں تو تم چلی ہی جاؤ ان کے پاس۔ سلیم دفتر سے آتا ہی ہوگا۔

ملازمہ: ہاں بیگم جی۔۔۔ بیماری اکیلی ہیں وہ۔۔۔ (دھڑکے سوچ کر) میرے  
تو خیال میں بیٹی سے اداس ہو گئی ہیں۔ اس پہانے بلا بھیجا ہوگا۔

ساس: (برہان کر) لو۔۔۔ تم تو اپنی ہی ہانگو گی۔۔۔ بھلا ان کی بیٹی پر ہم  
نے کوئی پابندی لگا رکھی ہے۔۔۔ جب جی چاہے جاسکتی ہے۔۔۔  
چار ماہ میں کتنے پھرے لگا چکی۔۔۔ ابھی تین ہفتے تو نہیں ہوئے اے۔

ملازمہ: (خفت سے ہاتھ ملتے ہوئے) وہ تو۔۔۔ بیگم جی۔۔۔ میں نے  
بہو بیگم کا جی رکھنے کو بات کی تھی۔۔۔ ورنہ۔۔۔ آپ جیسی ساس ملنا  
تو بہو جی کی خوش قسمتی ہے۔

ساس: (خوش ہو کر) بس تو الٹی سیدھی نہ ہانکا کر۔۔۔ ہاں تو خالہ بیٹی۔۔۔  
تم تیاری کرو۔۔۔ پانچ کی گاڑی سے چل ہی جاؤ۔۔۔

خالہ: (آنسو آنچل سے خشک کرتے ہوئے) وہ آئیں نا۔

ساس: وہ بھی آجائے گا۔۔۔ تم تیاری تو کرو۔۔۔ اٹھی کیس میں کپڑے

ساس: (اس کے قریب بیٹھتے ہوئے) خالہ۔۔۔ اے بہو۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔  
روکیوں رہی ہو۔

خالہ: (کچھ اور زیادہ رونے لگتی ہے) اماں۔۔۔ اماں۔۔۔  
ساس: (گھبرا کر) کیا ہوا اماں کو۔

خالہ: (خط اس کی طرف بڑھا کر) بیمار ہیں۔

ساس: یا اللہ خیر۔۔۔ میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔۔۔ کیا لکھا ہے۔۔۔ تم  
ہی سنا دو۔۔۔

خالہ: (خط پٹائی پر رکھ کر) اور تو کچھ نہیں لکھا۔۔۔ صرف اتنا ہی لکھا ہے  
کہ بیمار ہیں۔

ساس: نگہت کا خط ہوگا!

خالہ: جی نہیں۔۔۔ وہ تو دو ہفتے ہو گئے چلی گئی تھی۔ اس کامیالے گیا تھا۔  
ساس: بے ہے۔۔۔ تو اب۔۔۔ گھر میں اکیلی ہیں۔

خالہ: (روتے ہوئے) ہسائی کا خط ہے۔۔۔ کوئی پاس نہیں ہوگا نا جی  
تو گلشن کی اماں سے لکھوایا۔۔۔ دس بارہ دن سے بیمار ہیں۔

ساس: توبہ۔۔۔ اتنے دنوں سے بیمار اور اطلاع اب بھجوائی۔۔۔ ہو بیگم برا نہ  
منانا۔۔۔ تمہاری اماں تکلف بہت کرتی ہیں۔

خالہ: (رونے لگتی ہے)

ساس: (منہ بنا کر) ایسا بھی تکلف کیا۔۔۔ بیمار تھیں۔ اسی دن بلوا بھیجتی تھیں۔  
گھر میں کوئی اور ہوتا تو بات بھی تھی۔۔۔ ملازمہ تو ہو گی نا؟

خالہ: (سسکیاں لیتے ہوئے) پتہ نہیں جی۔۔۔

ساس: (ہمدردی کا بے پناہ اظہار کرتے ہوئے) ہائے ہائے۔۔۔ دس بارہ  
دن سے بیمار۔۔۔ تنہا۔۔۔ اُف۔۔۔ کیسے دن گزار رہی ہوں گی۔

(خالہ پھر رونے لگتی ہے۔۔۔ ملازمہ اندر آتی ہے۔ زیادہ

ساس: گھبراؤ نہیں بیٹا۔ ان کی اماں کی بیماری کا خط آیا ہے۔  
 سلیم: رافسوس ظاہر کرتے ہوئے) اوہو — رفاں کیس میز پر رکھ کر خط  
 پڑھتا ہے) دس بارہ دن سے بیمار ہیں — کتنی بری بات ہے اکیل  
 ہیں بالکل — (مضطربانہ ٹہلنے لگتا ہے —)  
 ساس: وہی تو میں سوچ رہی ہوں کیا کرتی ہوں گی بیچاری — نگہت بھی تو  
 چلی گئی ہے اور اللہ جانے ملازمہ بھی پاس ہے کہ نہیں۔ — رگہری آہ  
 بھر کر) اکلوتی اولاد بھی کسی کی نہ ہو —

سلیم: رماں کی طرف دیکھ کر) اب؟  
 ساس: اب کیا؟ تیاری کرو اور پانچ بجے کی گاڑی سے لے جاؤ بہو کو جب سے  
 خط ملا ہے رو رہی ہے۔ اللہ جانے وہاں ماں کا کیا حال ہوگا۔  
 سلیم: رکلائی سے کوٹ قدرے کھینچ کر وقت دیکھتا ہے) ابھی وقت تو کافی ہے  
 — ہم پانچ کی گاڑی پکڑ سکتے ہیں۔

ساس: ہاں — سات ساڑھے سات وہاں پہنچ جاؤ گے — جلدی کرو خالدہ  
 اٹھو۔ تیاری کرو اپنے کپڑے رکھ لو اپنی میں۔ سلیم کے دو جوڑے بھی ڈال لو۔  
 سلیم: ہاں خالدہ — تم تیاری کرو۔ میں اپنی درخواست لکھ کر وزیر اعلیٰ کو دے آؤں  
 خالدہ: رنگین کپڑوں والی نئی دلہن اٹھ کھڑی ہوتی ہے) کتنے دن کی چٹھی لیں  
 گئے آپ۔

ساس: (سلیم سے پہلے بول اٹھتی ہے) دو دن کی کافی ہے۔ تم کچھ دن رہ لینا۔ سلیم  
 واپس آجائے گا۔  
 خالدہ: اچھا۔

(خالدہ اٹھ کر چیزیں اٹھانے رکھنے لگتی ہے — سلیم کرسی پر  
 بیٹھ کر درخواست لکھنے لگتا ہے۔)  
 ساس: (ملازمہ سے) تم جلدی سے چائے بنا دو۔

رکھ لو — سلیم کا سامان بھی تیار کر لو — ضرورت ہوئی تو تم وہیں رہ جانا  
 ہفتہ دو میں اماں ٹھیک ہو گئیں تو واپس آ جانا —  
 خالدہ: (شکر سے ساس کو دیکھتی ہے —)  
 ملازمہ: ایک لڑکی ان کی اماں کے ہاں رہتی تو تھی۔

ساس: اسے اس کامیاں لے گیا۔ اپنی اولاد تھوڑا ہی تھی۔ جوان کی تنہائی کا  
 احساس ہوتا —

ملازمہ: ہاں بی بی اپنے خون کی تڑپ ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیکھو نا — رورو  
 کر ہلکان ہو رہی ہیں۔

ساس: ماں جو ہوئی —  
 ملازمہ: بہو بیگم کے والدین حیات ہوتے تو بیچاری بیٹی کو بیاہنے کے بعد یوں اکیل  
 تو نہ رہ جاتیں۔ ہائے ہا — خدا کی مرضی۔

ساس: اللہ بے نیاز ہے۔  
 خالدہ: (پھر رونے لگتی ہے)  
 ساس: بہو بیگم یہ غلط بات ہے۔ رورو کر تم اپنی آنکھوں کا ستیاناس کر لو گے۔ (باہر  
 سے سلیم کی آواز آتی ہے)

ملازمہ: صاحب جی آگئے۔  
 ساس: سلیم ہی ہے۔ چلو خالدہ بیٹی اب آنسو لو نہچ لو۔ تیاری کرو جانے کی۔  
 (سلیم ایک خوبصورت شگفتہ مزاج نوجوان ہے۔ نئے سوٹ  
 میں بلوس۔ فائل کیس لیے اندر داخل ہوتا ہے۔ خالدہ کو  
 روتے دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔)

ساس: سلیم ہی ہے۔ چلو خالدہ بیٹی اب آنسو لو نہچ لو۔ تیاری کرو جانے کی۔  
 (سلیم ایک خوبصورت شگفتہ مزاج نوجوان ہے۔ نئے سوٹ  
 میں بلوس۔ فائل کیس لیے اندر داخل ہوتا ہے۔ خالدہ کو  
 روتے دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔)

سلیم: رماں سے) کیا ہوا؟ روکیوں رہی ہیں۔  
 ملازمہ: (ساس سے پہلے بول اٹھتی ہے) روئیں نہ تو اور کیا کریں۔  
 سلیم: (گھبرا کر) کیوں امی!

ملازمہ: ابھی بناتی ہوں — اٹھ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔  
 سلیم: خالدہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بس اتنی ہی ہمت ہے جناب  
 کی — خط آیا اور رو رو کر یہ حال کر لیا۔  
 ساس: ماں جو ہوئی — یاد نہیں پچھلے سال جب میں بیمار ہوئی تھی تو میری  
 بخو کراچی سے ہوائی جہاز سے آئی تھی۔  
 سلیم: جی ہاں۔ ارکڑ پہنچتی تھیں (مسکراتا ہے)  
 ساس: ارکڑ ہی تو پہنچی تھی — رو رو کر ہلکان ہو گئی تھی — بیٹیوں کو  
 ماؤں سے بڑی محبت ہوتی ہے۔

سلیم: اس کا ثبوت خالدہ خانم بھی دے رہی ہیں — حد ہو گئی —  
 ساس: بخو تو ترپتی تھی میرے لیے۔  
 سلیم: یہ سب خواہی بیٹیاں ایک ہی مزاج کی ہوتی ہیں۔  
 ساس: چل چل باتیں نہ بنا — جلدی کر —  
 سلیم: بہت اچھا امی — درخواست تو میں نے لکھ لی۔ وزیر علی کو دے  
 آؤں۔ جب تک خالدہ کو تیار کر دیجئے (کمرے سے نکل جاتا ہے)  
 ساس: ہاں خالدہ ذرا جلدی کرو — لو میں تمہارا زیور بھی لے آؤں۔  
 خالدہ: نہیں جی — زیور کی کیا ضرورت ہے۔

ساس: نہ ہو — زیور ساتھ لے جاؤ۔ لوگ کہیں گے — مانگے کا ہوگا۔ جو  
 تیسرے چوتھے پھیرے ہی ہو کو یوں بیچ دیا۔ پوٹیاں تو پہن رکھی ہیں۔  
 گلے کاٹوں کی چیزیں بھی پہن کر جاؤ خالدہ سامان سنبھالنے لگتی ہے ساس  
 کمرے سے نکل جاتی ہے)

(پچھلے متوسط طبقے کا گھر — چوٹا سا کمرہ — ایک طرف پرانا پلنگ  
 ہے جس پر خالدہ کی امی پڑی ہے — قریب ہی ایک ٹکڑی کی  
 مہنر پردوائی کی شیشیاں اور گلاس وغیرہ رکھا ہے۔ ایک پرانی کرسی بھی پڑی  
 ہے۔ جس پر بی ہمسائی بیٹھی ہے — کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی  
 ہیں۔ بیرونی کھڑکی بند ہے۔ کونے میں دو صندوق اوپر تلے پڑے ہیں ایک  
 کونے میں میلے کپڑے ہیں۔ بستر بھی میلہ سا ہے۔ خالدہ کی امی بڑی کمزور  
 ہو رہی ہیں۔ کمرے میں ہلکی روشنی کا بلب لگا ہے۔ اس کی دھیمی روشنی  
 میں بخار کی حدت سے متمنائے۔ خالدہ کی امی کے گال سرخ نظر آ رہے  
 ہیں۔ ہونٹوں پر پڑیاں جمی ہیں — اسے ولے کرتی ہے۔ کبھی آف  
 آف کی صدا میں ہونٹوں سے نکلتی ہیں)۔

امی: گلشن کی اماں — تم جا کر آرام کر دو تھک چکی ہوگی۔

ہمسائی: میرا فکر نہ کرو بی بی۔

امی: خالدہ کو خط ڈال دیا تھا — ہائے۔ — ہائے۔ — خط ڈال دیا  
 تھا نا۔

ہمسائی: ہاں۔  
 امی: کس نے لکھا تھا۔

ہمسائی: گلشن نے۔

امی: کیا لکھا تھا۔ بہت زیادہ بیمار کا تو نہیں ہائے۔ ہائے نہیں لکھ دیا تھا۔ لیکن اب۔۔۔

ہمسائی: میں تو چاہتی تھی۔ خالدہ کو آنے کا لکھ دوں۔ تم نے ہی منع کر دیا۔ امی: بھلا ہی لیتی اسے تو اچھا تھا۔ یہ بخار تو جان لے کر ہی ٹلے گا۔۔۔ رانکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، پانی۔۔۔ اُف۔۔۔ جل رہی ہوں پانی ہمسائی: راٹھ کر میز سے گلاس اٹھا کر اسے دیتی ہے، اور۔

امی: راٹھنے کی کوشش کرتی ہے، لاڈ۔۔۔ لاڈ۔۔۔ رسانس پھول جاتی ہے) ہمسائی: لاڈ میں پلا دیتی ہوں۔

رہی ہمسائی اس کے سر کو ہاتھ سے سہارا دے کر اٹھاتی ہے اور گلاس اس کے لبوں سے لگا دیتی ہے۔

امی: (سر تکیے پر رکھتے ہوئے) بس۔۔۔ تیرا بھلا ہو گلشن کی اماں۔۔۔ خدا نبھے اس کا اجر دے، دن رات ایک کر دیا ہے۔۔۔ رانوں نکل آتے ہیں آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

بی ہمسائی: شرمندہ کر رہی ہو بہن۔۔۔ ہمسائے ماں باپ جائے ہوتے ہیں یہ تو ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ تم اکیلی بخار میں چھینکتی رہو۔ اور ہم آرام سے گھر بیٹھے رہیں۔

امی: (سر بے چینی سے ادھر ادھر مارتے ہوئے) اللہ تیرا بھلا کرے۔ رجاؤ اب سو جاؤ۔ کب تک بیٹھو گی۔

ہمسائی: میں تو آج رات تمہارے پاس ہی سوؤں گی۔۔۔ اتنا تیز بخار ہے۔ رات کہیں اٹھنا پڑا تو کیا کرو گی۔ پانی بھی تو بار بار پی رہی ہو۔ دوائی بھی دینا ہوتی ہے۔

امی: (رو پڑتی ہے) خدا ایللا بھی کسی کو نہ کرے۔

ہمسائی: (راٹھتے ہوئے) لاڈ سرد بادوں۔

امی: نہیں۔ نہیں۔ ہائے۔۔۔ سارا بدن جل رہا ہے میرا۔ ٹھنڈا پانی دو بس۔۔۔

ہمسائی: اس دوائی سے بس آرام نہیں آیا۔۔۔ (پانی پلاتی ہے) خدا ہی اپنا فضل کرے۔۔۔ صبح تو میں خالدہ بیٹی کو بلاوے کا خط لکھ دوں گی۔۔۔ اسے بلی۔۔۔ اتنی تکلیف میں ہو۔ بیٹی آگئی تو ادھی بیماری کسٹ جائے گی۔

امی: رانوں پونچتے ہوئے) سچ کہتی ہو۔ لیکن۔۔۔ کہیں اس کے سسرال والے بڑا زمانہ جانیں۔ ابھی۔۔۔ ابھی تھوڑے دن ہی تو ہوئے گئی ہے۔ میری بچی۔۔۔ خدا اسے خوش رکھے۔۔۔

ہمسائی: خالدہ کے سسرال والے بہت اچھے ہیں۔ بڑا کیوں منائیں گے۔ امی: اچھے تو ہیں واقعی۔ میری بچی کی خوش قسمتی ہے۔ جو ایسا بڑا مل گیا۔ ورنہ۔۔۔ میں کس قابل تھی۔۔۔ (روتی ہے) شکر ہے وہ اچھے گھر میں بیاہی گئی۔

ہمسائی: خالدہ بیٹی واقعی بڑی خوش قسمت ہے۔۔۔ پیسہ تو الگ چیز ہے۔ وہ لوگ بڑے مروت اور خلوص والے ہیں۔

امی: سلیم بھی بہت اچھا ہے۔ ماں کی سی عزت کرتا ہے۔ ہائے ہائے پانی۔۔۔ (لبوں پر زبان پھیرتی ہے)۔

رپانی پلاتی ہے۔ باہر تانگے کی آواز آتی ہے۔

امی: اسے گلشن کی اماں۔۔۔ ذرا۔۔۔ ذرا کھڑکی سے دیکھنا۔ اُف۔۔۔ دیکھنا لگتا ہے تانگہ رکا ہے۔

ہمسائی: (کھڑکی کی طرف جاتی ہے) تانگہ ہی ہے۔

امی: (گھبراہٹ، خوشی اور بے چینی کے تاثرات، لگتا ہے۔ میری خالدہ

سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعاؤں دیتی ہے۔ بی ہمسائی کرسی پلنگ کے قریب کر دیتی ہے۔  
 ہمسائی: بیٹھو بیٹا۔ خالہ بیٹی بس اب حوصلہ کرو۔ تم آگئی ہو۔ تو تمہاری اماں ٹھیک ہو جائیں گی۔  
 سلیم: بڑے افسوس کی بات ہے خالہ جان۔ آپ اتنی تکلیف میں تھیں اور ہمیں اطلاع ہی نہ بھیجی۔ امی بھی شاکی تھیں کہ آپ میں غیر سمجھتی ہیں۔  
 امی: اللہ تمہیں زندگی دے بیٹا۔ تمہیں غیر سمجھوں گی۔ تو اپنا کون ہو گا۔  
 ہائے سوچا تھا۔ بخار ہے اتر ہی جائے گا۔ لیکن یہ کم بخت تو۔  
 اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

خالہ: (ماں کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) میری اماں۔  
 میری پیاری اماں۔ اتنی بیمار اور اکیلی۔ (رونے لگتی ہے)  
 امی: اکیلے تو نہ تھی بیٹی۔ گلشن کی اماں بیمار ہی دن رات دیکھ بھال کرتی رہی ہے۔ میں تو ان کا احسان نہیں اتار سکتی۔  
 ہمسائی: پھر وہی بات۔ ہمسائے آخر کس لیے ہوتے ہیں۔  
 خالہ: رتن شکرانہ اسے دیکھتی ہے) خالہ جی۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔ آپ بھی اماں کی دیکھ بھال نہ کرتیں تو جانے میری اماں کا کیا حال ہوتا۔  
 سلیم: میرا تو خیال ہے خالہ۔ خالہ جان کو ہم اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔  
 امی: جیتے رہو بیٹا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔  
 ہمسائی: یہ تو بہت ہی اچھا کرو گے بیٹا۔ یہاں اکیلے۔  
 امی: (بات کا ٹکڑا نہیں گلشن کی اماں میں نہیں ٹھیک ہوں۔ بخار اتر جائے تو پھر کیا ہے۔ تکلیفیں آتی ہی رہتی ہیں۔  
 سلیم: (جھک کر ان کے قریب ہوتے ہوئے) افسوس کی بات ہے خالہ جان کیا میں آپ کا بیٹا نہیں۔

آگئی۔ خط مل گیا ہو گا نا۔ کون ہے۔ گلشن کی اماں۔  
 ہمسائی: (کھڑکی سے جھانکتے ہوئے) آں۔ میرا خیال ہے خالہ ہی آئی ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ خالہ ہی ہے بی بی۔ چلو اچھا ہوا۔  
 ساتھ سلیم بھی ہے۔  
 امی: رستہ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) ہائے۔ کتنا گندہ۔ گندہ ہو رہا ہے۔  
 کمرہ۔ گلشن کی اماں۔ ذرا۔ وہ کونے والے کپڑے تو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔  
 ہمسائی: اے ہے۔ اپنی بیٹی ہی ہے۔ کمرہ بھی صاف ہو جائے گا۔  
 تم آرام سے لیٹ جاؤ۔

امی لیٹ جاتی ہے بی ہمسائی جلدی جلدی چیزیں اٹھاتی ہے۔  
 کپڑے دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔ خالہ کا لے برقعے میں اندر آتی ہے برقعے کا اوپر والا حصہ گلے ہی میں لٹک رہا ہے۔ تیر کی سی تیزی سے ماں کی طرف آتی ہے۔ اور امی کہہ کر ماں سے لیٹ جاتی ہے۔ دونوں رونے لگتی ہیں۔  
 ہمسائی: بس بیٹی۔ اچھا کیا تم آگئیں۔ تمہاری اماں تو سخت گھبرا رہی تھیں۔  
 خالہ: (سر اٹھا کر ماں کو دیکھتی ہے۔ پھر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگتی ہے) اماں۔ میری اماں۔

سلیم: (اچھی کیس ہاتھ میں لیے اندر آتا ہے)  
 سلیم: السلام علیکم۔ راپچی زمین پر رکھ کر پلنگ کی طرف جاتا ہے۔  
 بی ہمسائی: وعلیکم السلام۔ جیتے رہو بیٹا۔ اچھا ہی کیا خالہ کو لے آئے۔  
 بیپاری۔  
 سلیم ماں کے قریب جھک جاتا ہے۔ خالہ کی امی اس کے

امی : رگلوگیر آوازیں ( بیٹا ہی تو ہے ۔  
 سلیم : پھر آپ کو کیا اعتراض کیوں ہے ۔ بیٹے کو خدمت کا موقع ملنا چاہیئے ۔

خالدہ : لیکن — !

سلیم : ( پیار سے ) تم چپ رہو جی — یہ ماں بیٹے کا معاملہ ہے ۔  
 ( خالدہ مسکراتے لگتی ہے )

سلیم : خالدہ جان میں آپ کو ساتھ لے کر ہی جاؤں گا — یہاں اکیلے پڑے  
 رہنا ظلم ہے —

امی : ( آنکھوں میں آنسو بھرتی ہے )

سلیم : بس خالدہ — فیصلہ ہو گیا — خالدہ جان ہمارے ساتھ چلیں گی ۔  
 امی : بیٹا — سنو — تو —

سلیم : نہیں — میں کچھ نہیں سننے کا — میری چھٹی سات دن کی ہے —  
 آٹھویں دن ہم سب اپنے گھر ہوں گے — میری ماں میرے پاس رہ  
 سکتی ہیں تو آپ کیوں نہیں رہ سکتیں ۔ اللہ کا فضل ہے خالدہ جان آپ  
 کے آجانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا — خوشی اور تسکین کا  
 احساس ضرور ہوگا —

امی آنسو بھری آنکھوں سے دعائیں دیتی ہے ۔ خالدہ خوش  
 نظر آنے لگتی ہے )

( سلیم کے گھر کا ایک صاف ستھرا کمرہ — سفید بے داغ بستر پر خالدہ  
 کی امی تکیے سے ٹیک لگاٹے بیٹھی ہے ۔ قریبی میز پر سفید رومال پڑا ہے  
 — ترتیب سے دوائی کی شیشیاں پڑی ہیں ۔ ایک پلیٹ میں موسمی  
 پھل رکھا ہے — سامنے کرسیاں پڑی ہیں ۔ ایک پر سلیم بیٹھا اخبار  
 دیکھ رہا ہے ۔ دوسری پر اس کی امی بیٹھی سبزی بنا رہی ہیں ۔ خالدہ ماں  
 کے قریب بیٹھی اسے چائے پلا رہی ہے — )

خالدہ : ( محبت سے ) اماں — اب تو آپ بالکل صحت مند لگ رہی ہیں ۔  
 سلیم : ( اخبار ایک طرف رکھ کر ) واقعی — خالدہ جان اب آپ بستر چھوڑ دیں  
 لائنس کر ، دیکھا کیسا جادو ہے ہمارے پاس — آپ تو یہاں آنے کا  
 نام ہی نہ لیتی تھیں —

خالدہ کی امی : اللہ تمہیں زندگی دے بیٹا ۔

سلیم کی امی : خواہ مخواہ تکلف کرتی تھیں — اکیلے میں تو بیماری دو گنی  
 ہو گئی تھی — اچھا کیا تھا — بیٹے انہیں اپنے ساتھ ہی لے آئے ۔  
 دونوں میں ٹھیک ہو گئیں ۔

خالدہ کی امی : یہ سب آپ کے خلوص اور محبت کا اثر ہے بہن — میں  
 عمر بھر آپ کا احسان نہ اتار سکوں گی ۔

سلیم : خوراک کا بھی پورا خیال رکھنا۔ خالہ جان کنجوسی پر نہ اتر آئیں۔ پھل اور دودھ خاص طور پر دینا ہیں۔

خالہ : جی دے رہی ہوں سلیم گھڑی پر وقت دیکھ کر ”مجھے ذرا کام سے جانا ہے“ کہہ کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

سلیم کی اماں کے چہرے پر کچھ ناگواری کے سائے پھر لہراتے ہیں۔ سبزی کا متال اٹھا کر باہر جانے لگتی ہے۔ خالہ بڑھ کر متال پکڑنا چاہتی ہے۔

خالہ : لائیے میں مائی کو باورچی خانے میں دے آؤں۔

سلیم کی امی : (ٹھنڈے لمبے میں) میں خود ہی لے جاتی ہوں۔ تم ماں کی خدمت کرو۔ خالہ ششدر سی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ ساس کے لمبے کی چھمن اسے بری طرح کھٹکتی ہے۔ لیکن ماں کے خیال سے چہرے پر شگفتگی کے آثار لے آتی ہے۔

خالہ : اماں اب آپ لیٹ جائیں۔ لائیے ذرا ٹانگیں دبا دوں۔

امی : نہیں بیٹی میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جا کر اپنی ساس کا ہاتھ بٹاؤ۔ دوپہر کا کھانا تیار کر لو۔

خالہ : وہ تو روز میں ہی کرتی ہوں۔ امی — مائی تو اوپر کا کام کرتی ہے۔

امی : (کچھ سوچتے ہوئے) خالہ بیٹی — اب میں بالکل تندرست ہوں سوچتی ہوں واپس ہی چلی جاؤں — کب تک یہاں رہوں گی۔

خالہ : سلیم کہتے ہیں آپ اب یہاں ہی رہیں گی۔

امی : یہ تو اس کی سعادت مندی ہے بیٹی —

خالہ : ہرج بھی کیا ہے اماں — سلیم کی ماں اس کے گھر میں رہ سکتی ہے تو خالہ کی ماں کیوں یہاں نہیں رہ سکتی۔

امی : پنگلی —

سلیم : لیجئے — یہ احسان ہو گیا۔ خالہ جان آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے — میں آپ کا بیٹا نہیں کیا؟

سلیم کی امی : کو کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی ہے۔ ماتھے پر ناگواری کے اثرات ہیں۔ لیکن بہت جلد اپنی ذہنی کیفیت پر قابو پالیتی ہے۔

سلیم کی امی : متح کہہ رہا ہے سلیم — یہ بھی آپ کا گھر ہے۔ ہفتہ بھر اور یہاں رہیں۔ تو کوئی پہچان ہی نہ سکے گا۔ کہ اتنی بیماری کاٹی ہے۔

سلیم : ہفتہ بھر کیوں —؟ امی اب ہم انہیں یہیں رکھیں گے — وہاں اکیلے کیا کریں گی۔

سلیم کی امی : (دھکلاتے ہوئے) ہاں — ہاں — کیا ہرج ہے خالہ کی امی : (اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) نہیں بہن — میں تو اب سوتھ رہی ہوں۔ واپس جانے —

خالہ : (بے قرار ہو کر) اماں — ابھی سے واپس جانے کا بھی سوچنے لگیں۔ ابھی تو آپ اچھی طرح چل پھر بھی نہیں سکتیں۔

سلیم : ان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے خالہ — ہم انہیں جانے تھوڑا ہی دیں گے۔

خالہ کی امی : (مسکراتے ہوئے) بس اتنا ہی کافی ہوتا ہے بیٹا —

سلیم : کیوں؟ مجھے تو آپ کی منطق سمجھ نہیں آئی — لیکن اب آپ یہاں سے جا نہیں سکتیں۔ کیا فرق پڑ جائے گا۔ جہاں گھر میں میری امی ہیں۔

دوبھائی ہیں، ایک پھوپھی ہیں۔ وہاں آپ ہوں گی۔ تو کیا فرق پڑے گا۔ خالہ : سلیم ٹھیک کہتے ہیں امی — رچائے کی پیالی میز پر رکھ کر ماں کے گھٹنوں پر کھیل ڈال دیتی ہے —

سلیم : دوائی ابھی بند نہیں کرنا خالہ — دے رہی ہوں نا وقت پر۔

خالہ : جی۔



خالدہ: مجھے پتہ ہے اماں — روز میں ہی پکاتی ہوں نا — ابھی کافی وقت ہے۔

امی: مائی شاید ابھی تک نہیں آئی۔ جا پتہ تو کر۔

خالدہ: (اماں کے پلنگ سے اٹھتے ہوئے دوپٹہ درست کرتے بڑبڑاتی ہے) خدا جانے روز بروز امی جی کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کچھتی کچھتی رہتی ہیں۔ یوں جیسے کوئی غیر ہوں۔

امی: اپنی اپنی عادت ہی ہے نا۔

خالدہ: ان کی عادت اب بگڑتی چل جا رہی ہے۔ پہلے تو پیار اور محبت سے ہر کام کا کہتی تھیں۔ اب سرے سے مجھے تو کچھ کہتی نہیں۔ مائی کے بہانے مجھے سناقتی رہتی ہیں۔

امی: خالدہ — ایسی باتیں نہ کرو۔

خالدہ: سچ کہہ رہی ہوں اماں — امی جی میں بڑی تبدیلی آرہی ہے۔ شاید اب ساس بننے پہ اُتر آئی ہیں۔

امی: تو اپنے کام سے کام رکھا کر بیٹی۔ بڑے چار باتیں کر بھی لیں تو درگزر کرنا چاہئیں۔

خالدہ: وہ تو کرتی ہی ہوں اماں — لیکن پتہ نہیں، انہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ (باہر سے پھر آواز آتی ہے)

آواز: کہاں دفع ہو گئی تھی — تجھے بھی کچھ احساس نہیں ہوتا۔ میں بوڑھی

جان کو کہاں کہاں گھسیٹتی پھروں — گھر میں کسی کو ذمہ داری کا احساس ہی نہیں — تجھے بھی پر لگنے لگے ہیں — بھلے کا زمانہ ہی

نہیں رہا — ذرا منہ لگاؤ تو سر پر چڑھ کر ناچنے لگتے ہیں لوگ۔ ہونٹ — گھروالے بیگانے اور بیگانے گھروالے — ہونٹ —

(خالدہ اماں کو اور اماں خالدہ کو دیکھنے لگتی ہیں —)

خالدہ: پگلی نہ پگلی — آپ کو ہم کبھی جانے نہیں دیں گے۔ وہاں اکیلی رہ کر کیا کریں گی۔

امی: وہ میرا اپنا گھر ہے بیٹی۔

خالدہ: اور یہ آپ کی بیٹی کا گھر ہے۔

امی: (رایوس آواز میں) ہر چیز کا اپنا ٹھکانہ ہوتا ہے بیٹی — ہر فرد اپنے مقام پر ہی بھلا لگتا ہے۔

خالدہ: اماں کی ٹانگیں دباتے ہوئے، آپ تو جانے کیسی باتیں کرتی ہیں۔

امی: اپنے تجربے کی۔

خالدہ: بس رہنے دیجئے تجربہ — آپ خواہ کچھ کہیں ہم آپ کو جانے توڑا ہی دیں گے۔

(باہر سے خالدہ کی ساس کی آواز آتی ہے وہ مائی پر برس

رہی ہے)

آواز: اے کہاں مر گئی — مائی — اے مائی —

کہاں دفعتان ہو گئی۔ سارا کام اسی طرح پڑا ہے — میں ہی رہ گئی

ہوں کام کرنے کو — جہنم میں جانے سب کچھ دُڑ بڑانے کی مسلسل

آواز آتی ہے —)

امی: خالدہ بیٹی جاؤ — دیکھو تو باہر جا کر — مائی کہاں گئی ہے —

جو کام ہے خود کر لو۔

خالدہ: پتہ نہیں امی جی کو کیا ہوتا جا رہا ہے — باورچی خانے کا کام سارا

سنبھال کر آئی ہوں۔ خدا جانے کونسا کام ہے۔ جس کے لیے اس

قدر بگڑ رہی ہیں۔

امی: جا کر دیکھ ہی لے نا — کھانا بھی تو پکانا ہے۔



خالدہ: (رجل کر) دیکھا اماں — کیسی باتیں کرتی ہیں امی جی —  
 امی: رانکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، یہ سب مجھے سنارہی ہیں بیٹی۔ عاقل  
 کے لیے اشارہ کافی ہونا چاہیئے۔ اب میں تندرست ہوں۔ مجھے  
 واپس چلے جانا چاہیئے۔  
 خالدہ: یہ کیا بات ہوئی — آپ ہر بات کو اپنی ذات سے منسوب  
 نہ کر لیا کریں۔  
 رانی آہ بھر کر آنکھیں پونچھنے لگتی ہے،

سساس کا کمرہ — سادہ سے پلنگ پر صاف ستھرا بستر لگا ہے  
 خالدہ کی ساس ایک گاؤں تیکہ کے سہارے بستر پر بیٹھی ہے۔ دھلے ہوئے  
 کپڑے پہنے ہے۔ لیکن چہرے پر ناخوش گواری کے آثار ہیں۔ کمرے کی  
 کھڑکیاں، دروازے کھلے ہیں — دو ایک کرسیاں، ایک میز اور دائیں  
 ہاتھ دیوار کے ساتھ اوپر تلے بکس رکھے ہیں۔ ملازمہ بیٹھی ان کے پاؤں دیا  
 رہی ہے — مالکن کا رخ دیکھ کر خوشامدی لہجے میں باتیں کر رہی ہے  
 سساس: اے کون آیا تھا ابھی —  
 مائی: سلیم صاحب تھے جی — بیگم جی —  
 سساس: اچھا — آج چھٹی ہے نا اسے۔ بازار گیا تھا۔ کچھ لے کر آیا۔  
 مائی: رزارداری کے لہجے میں ہاتھوں سے اشارہ کر کے — دو لفافے۔  
 اتنے بڑے بڑے — جانو مالٹے اور سیدب تھے — لے کر سیدھا  
 ان کے کمرے میں گئے —  
 سساس: (رجل کر) ہونہ — ان کے سوا نظر ہی نہیں آتا کوئی — (منہ بنا کر)  
 اٹھا لایا تھا۔ — بیماری کی پوٹ کو — اب خدمت ختم ہی نہیں  
 ہو رہی۔ ہونہ — وہ بھی کیا جم کر بیٹھ گئی ہے۔ واپس جانے کا  
 تو نام ہی نہیں لیتی۔

مائی: (رشتہ پاکر) واپس؟ تو بہ کریں بیگم جی۔ جسے اچھے سے اچھا کھانے کو ملے۔  
اسے کیا ضرورت پڑی ہے واپس جانے۔ بہو بیگم تو دیوانی ہوئی  
جاتی ہیں ماں کے لیے۔ زبردستی کھلاتی ہیں۔

ساس: مفت کا مال ہے نا۔۔۔ ساری عمر نصیب نہ ہوا ہوگا۔ پھل، دودھ  
انڈے، مکھن، بخینی۔۔۔ مہینہ بھر ہو گیا بخار لوٹے۔۔۔ غذا ابھی تک  
کھاٹی جا رہی ہے۔

مائی: (آنکھیں مشکاکر) آپ کو کیا بتاؤں بیگم جی۔ گھی کی چوریاں کھاٹی جا  
رہی ہیں ماں کو۔

ساس: گھی، ڈاکٹر نے گھی تو اسے منع کیا ہے۔  
مائی: پر میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں۔ بہو بیگم گھی میں گوندھ گوندھ کر روٹی  
پکاتی ہیں۔ ماں کے لیے۔

ساس: جبھی گھی کا تین دسویں دن ختم ہو جاتا ہے۔  
مائی: (چالاک سے) بیگم جی۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ مجھے تو ڈر ہی  
گتا ہے۔ کہیں میرا نام نہ لگ جائے۔ روز حلوے بنیں۔ پراٹھے پکیں۔  
گھی تو ختم ہو گا ہی۔ میں نے آپ کو خبردار کر دیا ہے۔ بیگم جی  
کہیں میرا نام نہ لگ جائے۔ کہ گھی میں گھرے جاتی ہوں۔

ساس: اے ہے۔ تو تو پاگل ہے بالکل۔ اچھا۔ آئندہ نظر رکھا کر  
کیا کیا پکتا ہے ماں کے لیے۔ سمجھیں۔ بتا دیا کر مجھے۔

مائی: (دباتے دباتے ادھر ادھر متوحش نظروں سے دیکھتی ہے) بیگم جی۔ آپ  
کو کیا کیا بتاؤں۔ ہم ٹھہرے لوکر لوگ۔ لگاٹی بھائی کریں تو۔  
برسی بات ہے۔ ورنہ میں نے ماں بیٹی کی باتیں اپنے کانوں سے ہی سنی ہیں

ساس: (جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ جاتی ہے) کیا؟  
مائی: چھوڑیئے بیگم جی۔ میرا تو دل بڑا ہوا تھا۔ آپ کا بھی بڑا ہوگا۔

ساس: اسے ہے کچھ بکے گی بھی۔

مائی: بہو جی سے کچھ پکائیے گا نہیں۔

ساس: اتنا ہی ڈر ہے اس کا بچے۔ میرے ہوتے وہ کون ہوتی ہے۔ تجھے کچھ  
کہتے والی۔

مائی: (چالاک سے) پھر بھی بیگم جی۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ روٹی کا آسرا

آپ آپ کے دم سے بنا ہے۔ ایسا نہ ہو بہو جی مجھے بھی لکھوا دیں۔

ساس: کچھ بتائے گی بھی اب۔ یا بکنی چلی جائے گی۔ تیری یہی باتیں  
تو مجھے ناپسند ہیں۔ کیا سنی تھیں باتیں۔

مائی: ماں بیٹی آپ کے خلاف بہت زہرا گل رہی تھیں۔

ساس: (دھڑک اٹھتی ہے) میرے خلاف۔ کیا تیرا میں نے انہیں۔

آنکھیں بند کیے گزارہ کر رہی ہوں۔ تو یہ سر پر ہی چڑھنے لگیں۔

مائی: (چالاک سے) اے بیگم جی۔ معافی دے دو مجھے۔ میں

نے کہا تھا نا۔ میرا دل بڑا ہوا آپ بھی نہ سیں۔

ساس: لیکن! ہونہ۔ انہیں جبراً ت کیسے ہوئی۔ میرے خلاف

باتیں کرنے کی۔ اپنی اوقات بھول گئی ہیں۔ میں تو کوستی ہوں

اس وقت کو جب لڑکی دیکھ کر ریحہ گئی تھی۔ بیٹی کے ساتھ ماں

بھی سر پر آن بیٹھی ہے۔ میرے بیٹے کو تو ہتھیایا ہی لیا ہے دونوں

جادوگر نیوں نے۔

مائی: بالکل بیگم جی۔ (ناک پر انگلی رکھ کر) ساس سے ہمدردی

سہی۔ لیکن ایسے دطرے بھی ہم نے کہیں نہیں دیکھے۔ صاحب جی  
تو آپ سے زیادہ ان کا خیال رکھتے ہیں۔

ساس: (رتلملاتی ہوئی پھسکارتی ہے) ہونہ۔

مائی: حکم اختیار تو سب بہو جی کا چلنے لگا ہے۔ کیا مجال جو صاحب جی ان

مائی: اچھا — اچھا جی — (زور زور سے دبانے لگتی ہے)  
 ساس: اور ہر بات سے خبردار بھی کیا کر مجھے —  
 مائی: (آگے پیچھے ہوتے ہوئے) بہت اچھا بیگم جی —  
 بہت اچھا۔  
 (ساس کبھی ادھر کبھی ادھر پہلو بدلتی ہے۔ ساتھ ساتھ بڑبڑ  
 بھی کیے جاتی ہے۔)

کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں۔  
 ساس: (دانت پیس کر) بیٹا میرا اور خدمت کرے خالہ کی  
 ماں کی۔  
 مائی: آپ کے پاس تو گھڑی دو گھڑی بیٹھیں گے — ساس  
 کے کمرے میں ہی نظر آتے ہیں ہر وقت — خالہ بی بی بھی  
 تو آگے پیچھے چمکتی پھرتی ہیں۔ میں کبھی آپ کی طرف داری  
 کی بات کر بھی دوں تو بس ڈانٹ کر رکھ دیتی ہیں بیگم جی —  
 میں نے تو آپ کا ہی نمک کھایا ہے — (رونے کی آواز بنا کر)  
 آپ کی برائی کیسے سن سکتی ہوں۔  
 ساس: (تمکلاتے ہوئے) ہوں — سیدھا کر لیتی ہوں سب کو۔  
 مائی: (رہا تھ جوڑ کر) بیگم جی — میرا نام نہ لیجئے گا۔  
 ساس: (جھٹاکر) تجھے اپنی ہی پڑی ہے۔  
 مائی: غریب ہوں۔ ڈرتی ہوں بیگم جی۔  
 ساس: (راز داری سے) ٹوہ میں رہا کر ذرا — کیا کب باتیں ہوتی ہیں —  
 مجھ تک بھی تو پہنچتی رہیں۔  
 مائی: بہت اچھا بیگم جی — ہم تو آپ ہی کا دیا کھاتے ہیں۔  
 ساس: (رلیٹ جاتی ہے) چل داب میرے پاؤں —  
 مائی: (پاؤں دبانے لگتی ہے)  
 ساس: سن۔  
 مائی: جی۔  
 ساس: باورچی خانے کا کام ہو کو کرنے دیا کر۔ اب دلہن بن کر ہی بیٹھی  
 رہے گی۔

ساس: بہانہ خوب گھڑتی ہیں۔ یہاں جم جانے کا۔۔۔ (نقل اتارتے ہوئے)  
میں تو چلی جاتی۔۔۔ سلیم کی محبت اور اصرار قدم روک لیتی ہے۔  
ہونہ۔۔۔ سلیم۔۔۔ ایک آدھ بار کہہ کیا بیٹھا۔۔۔ بات ہی پکڑ  
لی ہے اس نے۔

مائی: بیگم جی۔۔۔ آپ تو سمجھ دار ہیں ہی۔۔۔ بھلا گھر میں ایسا عیش میسر  
آتا ہوگا، بیچ پوچھیں تو مجھے صاحب جی پر بھی غصہ آتا ہے۔ اتنی بھی  
مسرت کا ہے کی۔۔۔ داماد ہو کر بچھے جاتے ہیں۔۔۔ ذرا رعب داب  
تو ہونا چاہیئے تا۔۔۔

ساس: سب سمجھتی ہوں۔۔۔ (آہ بھر کر) سرتو سلیم نے ہی چڑھایا ہے  
ماں بیٹیوں کو۔۔۔

مائی: آپ بھی تو صاحب جی سے کچھ نہیں کہتیں۔  
ساس: کیا کہوں۔

مائی: اے ہے بیگم جی۔۔۔ چلے بہانے انسان منا ہی دیتا ہے نا۔۔۔  
آپ نے تو ایک ہی چپ سادھ رکھی ہے۔۔۔ کڑھ کڑھ کر اپنا خون  
جلاتی ہیں۔۔۔ آج سر میں درد ہے۔ کل خدا نخواستہ کوئی اور بیماری  
ہلہ بول دے گی۔ فکر تو جان کی دشمن ہوئی ہے بیگم جی۔

ساس: (آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتی ہے) ہوں۔

مائی: صاحب جی کو بلاؤں۔

ساس: (نفی میں سر ہلا دیتی ہے)۔ باہر سے قدموں کی آواز آتی ہے۔ سلیم دروازے  
سے داخل ہوتا ہے)

مائی: لوہ خود ہی آگئے (مائی ہمدردی سے ماکن کا سر دبانے لگتی ہے)۔  
سلیم: راجلدی سے پلنگ کے قریب آکر ماں پر جھکتے ہوئے، کیا ہوا امی۔؟  
طبیعت خراب ہے۔ سرور ہو رہا ہے۔

دخالدہ کی ساس کا کمرہ۔۔۔ پلنگ پر صاف ستھرا بستر ہے۔ سر پر  
بٹی باندھے ساس آہستہ آہستہ ہائے کمرہ ہی ہے۔۔۔ میز پر چائے  
کی خالی پیالی رکھی ہے۔ چایوں کا گچھا اس کے تیکے کے قریب پڑا ہے۔  
ملازمہ اس کے پیچھے بیٹھی کمرہ بارہی ہے۔

مائی: بیگم صاحب جی، اسپر کی ٹیکہ کھالی آپ نے۔

ساس: نہیں۔۔۔ تو کمرہ دیا تو جا۔۔۔ ٹیکہ سے آرام ٹھوڑا ہی آئے گا۔

مائی: اسپر کی ٹیکہ تو جادو کی گولی ہوتی ہے بیگم جی۔۔۔ ادھر لنگل ادھر درد  
غائب کھا لیتیں تو اچھا ہی تھا۔۔۔ بہو بیگم نے کہا تھا۔ چائے کے ساتھ  
لے لیں۔

ساس: خود اگر نہ دے سکتی تھی۔

مائی: جی۔۔۔ جی۔۔۔ وہ تو آپ جانتی ہی ہیں نا۔۔۔ ماں ہوتی تو دوڑی  
آتیں (آنکھیں گھاگھا کر، حالانکہ میں نے بتایا ہی تھا۔ بیگم جی کے سر میں  
سخت درد ہے۔

ساس: اب تو مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔۔۔ گھر والے غیر ہو گئے  
غیر گھر والے بن بیٹھے۔  
مائی: اب تو اچھی بھلی ہیں بہو کی اماں۔۔۔ کیا چہرہ نکھر آیا ہے۔

مائی: (ہمدردی جتاتے ہوئے) صاحب جی — صاف بات کہوں۔ بیگم جی کو سرور سے زیادہ اس بات کا دکھ ہے۔ کہ صبح سے تڑپ رہی ہیں۔ بیگم نے اگر پوچھا نہ ان کی اماں نے —

سلیم جیسے چکرا سا جاتا ہے — اس کا موڈ بگڑنے لگتا ہے۔ ماں گوشہ نشین سے اس کو دیکھتی ہے — پھر گردن موڑ کر مائی کو مصنوعی غصے سے دیکھتی ہے)

ساس: تو بک بک کرتی ہی جائے گی — تجھے کس نے کہا دکالت کرنے کو بیگم فارغ تھوڑی ہے —

(سلیم سر جھکا کر سوچنے لگتا ہے — ماں تیر نشانے پر بیٹھتا دیکھ کر چہرہ اور پڑ مردہ بنا لیتی ہے)

مائی: آپ نے تو ایک ہی چپ سادہ رکھی ہے — ہم سے تو نہیں دیکھا جاتا یہ سب کچھ —

ساس: (آنکھیں بند کر لیتی ہے) گزارہ کرنا ہوتا ہے۔ تو کیا چاہتی ہے۔ ہر بات اچھا لگ کر گھر میں تماشہ کھڑا کر دوں — چل اب چپ رہ۔ — خبردار جو تو نے کوئی بات کی —

مائی: (آنکھیں مٹکا مٹکا کر) آپ کا دل گردہ ہی ہے — جو سب کچھ برداشت کیے جا رہی ہیں — کوئی اور ہوتا تو —

سلیم: (مائی کو جھڑک کر) تمہیں اتنی زبان کھولنے کی جرات ہو گئی — گھر کے معاملے میں تیرے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

رماں خفگی کے انداز میں نظریں گھماتی ہے — ماکن کو دیکھتی ہے پھر زور زور سے دہانا شروع کر دیتی ہے۔ سلیم غم غم سا نظر آتا ہے۔ پھر اٹھ کر باہر چلا جاتا ہے۔ ماں اور مائی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے لگتی ہیں —)

رماں چپ چاپ آنکھیں بند کیے پڑی رہتی ہے — ٹھنڈے ٹھنڈے گہرے گہرے سانس لینے لگتی ہے)

مائی: صبح سے یہ وقت اگیا — سرور ٹھیک ہی نہیں ہو رہا۔

سلیم: کیوں امی —؟ صبح سے تکلیف ہے۔ آپ نے بتایا ہی نہیں۔

ساس: (آواز میں نقاہت پیدا کر کے) کسے بتاتی بیٹا —

سلیم: خالہ سے کہا ہوتا — اسپرو دے دیتی۔ فوراً آرام آ جاتا۔

ساس: (طنز پر انداز میں) ہونہ (سلیم حیران ہو کر ماں کا منہ دیکھتا ہے۔)

مائی: (خوشنم بیگم مصروف تھیں — (آواز میں لگاؤ بھائی کی آگ ہے)

سلیم: ایسی کون سی مصروفیت ہے۔ کہ اسپرو کی ٹمکیہ بھی نہ دی جاسکتی۔ تم نے خالہ سے کہا تھا۔ کہ امی کو تکلیف ہے۔

ساس: کہنے کی کیا ضرورت ہے بیٹا — سرور رہی ہے ناٹھیک ہو جائے گا۔

سلیم: عجیب بات ہے — اتنی شدت کا درد اور صبح سے یوں ہی پڑی ہیں۔

ساس: اور کیا کرتی بیٹا — (گہری سانس لے کر) انسان بوڑھا ہو جائے

تو بے کار ہو جاتا ہے —

سلیم: امی۔

مائی: آپ کے دم قدم سے تو اس گھر میں رونق برکت ہے بیگم صاحب جی۔

خدا نہ کرے جو آپ بیکار ہوں — آپ کو اللہ سلامت رکھے۔

ساس: ہائے — آف — ذرا زور سے دبا سر کو — ٹیسس اٹھ رہی

ہیں۔ باتیں کیے جائے گی بس —

سلیم: (مائی سے) جاؤ خالہ سے اسپرو اور ایک گرم پیالی دودھ لے کر آؤ۔

ساس: پھوڑو بیٹا — (مائی سے) بیٹھ تو میرا سر دبا۔

سلیم: (حیرانگی سے) امی — کیا بات ہے — اسپرو کھ لینے

میں کیا ہرج ہے۔

مائی : بیگم صاحب جی — آنکھیں کھل گئی ہیں۔ صاحب جی کی —  
 ساس : چپ ہو گیا تھا۔ — کہیں کوئی بھگڑا ہی نہ کھڑا نہ کر دے — کم بخت  
 تو نے خواہ مخواہ جھوٹ بولا — خالده صبح تو مجھے پوچھنے آئی تھی۔ اس  
 کی اماں بھی دوبار آئی — شام مہمان آرہے ہیں۔ ان کا کھانا بھی تو  
 دونوں ماں بیٹی پکا رہی ہیں —  
 مائی : سب ایسے ہی چلتا ہے بیگم جی — صاحب جی کو کان تو ہو گئے —  
 اپنی ماں کو بھول ہی گئے تھے جیسے — صبح و شام ساس کی خدمت ہی  
 میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے —  
 ساس : بات تو تو نے اس کے کان میں ڈال دی — دلہن پر بگڑے گا ضرور۔  
 کہیں معاملہ بڑھ ہی نہ جائے —  
 مائی : آپ فکر نہ کریں جی سب سمیٹ لوں گی — سارے راہ جانتی ہوں  
 میں — ہوں —  
 ساس : وہ تو مجھے پتہ ہی ہے — چل دبا سر کو — ہاں ذرا آہستہ  
 آہستہ —

(بادرچی خانہ — دائیں ہاتھ تیل کا پوٹو لہا رکھا ہے۔ بائیں ہاتھ انگلی میٹھی میں کوٹلے  
 دھک رہے ہیں۔ کارنس پر کچھ برتن ہیں۔ الماری میں مختلف قسم کے ڈبلے پڑے ہیں۔ خالده  
 چوہلے کے قریب بیٹھی ہے۔ دونوں پوٹوں پر دیگیچیاں چڑھی ہیں — لگن میں سبزی  
 کاٹ کر رکھی ہوئی ہے۔ ایک تھال میں چاول ہیں۔ دو تین دیگیچیاں سامنے پڑی ہیں۔ چہرہ  
 متمتارہا ہے۔ دوپٹہ کارنس پر لٹک رہا ہے۔ شلوار کے پانچے چڑھائے کام میں مصروف ہیں  
 خالده کی اماں نل کے نیچے برتن اکٹھے کر رہی ہے۔ وہ برتن دھونے لگتی ہے —)  
 خالده : اماں کیا کر رہی ہیں ؟  
 امی : یہ برتن دھو ڈالوں — بہت سے جمع ہو گئے ہیں۔  
 خالده : وہ مائی کس مرض کی دوا ہے — آپ نے تو آہستہ آہستہ اس کے سارے  
 کام اپنے ہی ذمے ڈال لئے ہیں۔  
 امی : میں بھی تو بیکار بیٹھے تنگ آجاتی ہوں۔  
 خالده : یہ کیا بات ہوئی — آپ نے تو حد ہی کر دی (غصے سے) چھوڑیں برتن  
 دھو لے گی اگر — میں اسے بلاتی ہوں — وہ تو بہانے بناتی ہی رہتی ہے  
 امی : تمہاری ساس کا سر دبا رہی ہے — میں دھو ڈالتی ہوں۔ بیٹی دقت ہی کتنا لگے  
 گا۔ کام ابھی اور بھی تو بہت ہیں۔  
 خالده : بس آپ رہنے دیں برتن — دھوتی پھرے گی وہ — وہ تو جہان

امی : مجھے کیا خبر تھی ۔

خالدہ : اب دھیان ہی رکھئے گا امی ۔

( اماں برتن دھونے لگی ہے ۔ خالہ کبھی ایک دیگچی میں کبھی دوسری میں چچ چلاتی ہے ۔ سلیم باورچی خانے کے دروازے میں نظر آتا ہے ۔ وہ کچھ کھنچا کھنچا سا دکھائی دے رہا ہے ) ۔

خالدہ : ( مسکرا کر دیکھتے ہوئے ) صبح سے یہ وقت آگیا ابھی تک فارغ نہیں ہوئی تو بہ خدایا ۔ چھ آدمیوں کا کھانا پکانا کتنا مشکل ہے ۔ دعوت دینا بھی آج کل کون سا آسان کام ہے ۔

سلیم : خالہ ۔ امی کے سر میں درد ہے ( لہجہ تلخ سا ہے ۔ خالہ اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے )

خالدہ : میں نے چائے اور اسپرڈ بھجوا دی تھی ۔

سلیم : بھجوا کر فرض ختم ہو گیا تمہارا ۔ جا کر دیکھ نہ سکیں امی کو ۔ تڑپ رہی ہیں درد سے ۔

خالدہ : جی !

سلیم : تمہیں میری ماں کا کچھ تو احساس ہونا چاہیئے ۔

خالدہ : میں ۔ میں صبح گئی تھی ان کے کمرے میں ۔

سلیم : گئی تھی ۔ گئی تھی ۔ اس کا کیا مطلب ۔ اتنا نہ ہو سکا ۔ ذرا ان

کا سر ہی دبا دیتیں ۔ اتنی سی بات سے خوش ہو جاتیں وہ ۔

خالدہ : لیکن صبح سے تو میں یہاں مصروف ہوں ۔ کتنا کام ہے ۔

دیکھیں تو سہی ۔

سلیم : میں کچھ نہیں جانتا ۔ ( سلیم واپس مڑتے ہوئے بولا ) مجھے تمہارے رویے

سے کوفت ہوئی ہے ۔ تمہیں خود بھی احساس ہونا چاہیئے ۔ میری ماں کا بھی وہ

کوئی حق ہے ۔

چراغ ہی پھرتی ہے ۔ بس بہانہ ہے سردبانے کا ۔ اتنا احساس ہی نہیں اسے کہ آج کام زیادہ ہے ۔ امی جی بھی تو اسے کچھ نہیں کہتیں ۔ سر چڑھ گئی ہے بہت ۔ میرا کہا تو سنتی ہی نہیں ۔

امی : تو جانے دے بیٹی ۔ خواہ مخواہ اس کے منہ نہ لگا کر ۔ لگائی بھجائی کی بڑی عادت ہے اسے ۔ بڑی خزانہ عورت ہے ۔

خالدہ : مجھے تو ذرا اچھی نہیں لگتی ۔ ملازمہ ہو کر حکم چلاتی ہے مجھ پر ۔ کھانے کے لئے تو پوچھا ہی نہیں کبھی خود ہی نکال لیتی ہے ۔

امی : چیزیں بھی خوب اڑاتی ہے ۔ کبھی کاپیالہ بھر کر کئی دفعہ لے گئی ۔ میں تو چپ ہی رہتی ہوں ۔ کیا کہوں کیا نہ کہوں ۔

خالدہ : ہائے اماں ۔ آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا ۔ اس دن امی جی مجھے خاص طور پر سنار ہی تھیں ۔ کہ گھی کا ڈبہ دس دن میں ختم ۔ اندھیر ہے ۔ میں کچھ سمجھی نہ تھی ان کی بات ۔ چینی بھی اتنی جلدی ختم ہو گئی اس دفعہ ۔ میرا تو خیال ہے دودھ بھی پی جاتی ہے ۔ اڑھائی سیر دودھ روز آرہا ہے ۔ ایک گلاس آپ کو دیتی ہوں ۔ ایک امی جی کو ۔ بس باقی چائے پر ہی ختم ہو جاتا ہے ۔

امی : منہ چڑھی ہے نا مانکن کی ۔ تم کچھ نہ کہو ۔ پرانی ملازمہ ہے ان کی ۔

خالدہ : لیکن یہ بھی تو بری بات ہے نا اماں ۔ امی جی سمجھتی ہوں گی کہ میں نے ہیہ کھلے ہاتھوں خرچ شروع کر دیا ہے ۔ کبھی واقعی اب کے بہت جلد ختم ہو گیا ۔ صرف دود دفعہ سلیم کے لئے حلوہ ہی خالتو بنایا ہے ۔ درنہ وہی روز کا خرچ ہے ۔

امی : برتن دھونے لگتی ہے ، تماشا دیکھے جائیں ۔ کوئی موقعہ ہوا تو بات کر لیں گے ۔

خالدہ : جب گھی پیالہ بھر کر نکالتی ہے تو آپ پوچھتی نہیں ۔

امی : ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگی ۔ ہمسایوں کا دینا ہے ۔

خالدہ : تو بہ ! کب کبھی ہم نے مانگا ہے کسی سے ۔

خالدہ : آپ اس رنگ میں نہ سوچیں امی — آپ کی مجبوری بھی تو ہے ۔  
 امی : ہے تو سہی — لیکن —  
 خالده : خدا جانے آپ کی عمر ابھی کتنی پُری ہے — روز بروز کمزوری کی ہی جانب  
 بڑھ رہی ہیں نا — میں آپ کی بیٹی ہوں — آپ کو سنبھالنا میرا فرضِ امان —  
 آپ کا کوئی بیٹا نہیں، بھائی نہیں، شوہر نہیں — کون دیکھ بھال کرے گا آپ  
 کی —  
 (امی گہری سانس چھوڑتے ہوئے برتن دھونے لگتی ہے۔ خالده دگیچی کی طرف  
 متوجہ ہو جاتی ہے)۔



(ڈرڈر کرتا وہ واپس ہو جاتا ہے۔ امان کے ہاتھ کام کرتے رک جاتے ہیں۔ دونوں ماں  
 بیٹی ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی ہیں۔ خالده خاصی پریشان ہو جاتی ہے۔)  
 خالده : (سوچتے ہوئے) انہیں کیا ہوا ہے امان —  
 امی : خدا جانے —  
 خالده : امی کو صبح میں خود دیکھ کر آئی — اچھی بھلی تھیں — سرد د تھا۔ اسپر د  
 اور چائے بھجوا دی تھی۔  
 امی : میں بھی گئی تھی۔ باتیں کر رہی تھی مائی سے۔  
 خالده : بیٹے کو خدا جانے کیا کہا — خاصے بگڑے نظر آ رہے تھے سلیم۔  
 امی : (سر تشویش سے ہلاتی ہے) کچھ بگڑی بگڑی رہتی ہیں۔ تمہاری ساس۔  
 خالده : میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں امان —  
 امی : میری وجہ سے یہ سب کچھ ہے۔  
 خالده : تو بہ — آپ تو خواہ مخواہ میں رہنے سے منسوب کر لیا کریں۔  
 امی : تو نہیں جانتی بیٹی — میرے تجربے نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ مجھے  
 واپس جانے ہی دو — مجھے بہت محسوس ہوتا ہے۔ ابھی تو عزت سے چلو جاؤں گی  
 یہ نہ ہو گھر والے منہ کھول کر جواب دے دیں۔  
 خالده : (پڑ جاتی ہے) نہیں جانے دوں گی — نہیں جانے دوں گی — امان  
 یہ میرا گھر ہے — اور اس گھر پر آپ کا بھی حق ہے — کوئی اور ہوتا تو جانے بھی  
 دیتی آپ کو — (روہانسی ہو کر) ابو ہی زندہ ہوتے۔ تو کیا پُری تھی آپ کو یہاں  
 آنے کی — لیکن اب — اکیلی جان ہے آپ کی — یہاں رہنے سے  
 کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ کیا کھالیتی ہیں آپ — ہونٹ — سارا کام کرتی  
 رہتی ہیں — ملازموں کی طرح — پھر بھی — منہ سیدھا نہیں ہوتا ان کا۔  
 امی : (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر) جوش میں آنے کی ضرورت نہیں بیٹی — تمہیں کہا  
 ہے نا، ہر چیز کا اپنا ٹھکانا ہوتا ہے۔ دستور میں زمانے کے۔ بیٹی کے گھر پڑا رہنا ہے عزتی ہے۔



سمجھتی ہی نہیں — یہاں رہنے سے کونسا آرام مل رہا ہے مجھے۔ مفت کی ذہنی

کوفت ہی ہے۔ دنیا کی ریت یہی ہے —

خالدہ : جہنم میں گئی دنیا اور دنیا کی ریت —

امی : (نہر خند) تو بچی ہے ابھی — نہیں سمجھ سکتی — یہ معاملے نازک

ہوتے ہیں۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں چلی جاؤں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

خالدہ : امی آپ کا بار کس پر ہے — ؛ کتنا ہے آپ کا بار — سونے

کا نوالہ تو نہیں نگلتیں۔ اٹے دستوز بنے ہیں۔ لکیر کے فقیر بنے رہیں تو ٹھیک ہے۔

امی : چل چپ ہو جا — ابھی سلیم کے آنے کا وقت ہے۔ بات کا بتنگڑ بن

جائے گا پھر۔

خالدہ : بنتا ہے تو بنا کرے — آج سلیم آئیں — میں خود ان سے کھل

کر ساری بات کر دوں گی — میری اماں کی بے غزنی کروانے لے آئے تھے یہاں۔

(آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں)

(کمر پر ہاتھ رکھے — ماتھے پر ششکین ڈالے، ساس دروازے سے اندر

آ جاتی ہے۔ سخت طنز پر لبھے میں بولتی ہے۔ اس کا انداز لڑنے کا ہے — خالده

دیکھ کر رہ جاتی ہے۔ اماں گھبرا جاتی ہے)

ساس : کیا کہے گی کھل کر سلیم سے — میں بھی تو سنوں — کونسا تیر مارا

ہے اس نے — لگائی بجائی کرے خاوند سے — جادو گرنی تو ہے ہی —

ہتھکڑیا تو لیا ہے میرے بیٹے کو —

اماں : (اٹھ کر اس کے قریب آتی ہے) بہن آپ ناحق ناراض ہو رہی ہیں —

ساس : (ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتے ہوئے) حق پر تو بیٹھی ہے۔ میں تم دونوں کی

نیت اچھی طرح جانتی ہوں — گھر پر قبضہ جا کر مجھے نکالنا چاہتی ہو۔

خالدہ : امی جی — آپ سوچ کر بات کیا کریں۔

ساس : ہاں ہاں — یہی کہلوانا ہے نا مجھ سے — بات کرنا مجھے آتی

(خالدہ کا کمرہ — ماں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے کے انداز میں کمرے میں لاتی ہے۔

اور پھر اسے پلنگ پر بٹھا دیتی ہے۔ غصے سے چہرہ سرخ ہو رہا ہے — اماں

کے ہاتھ گیلے ہو رہے ہیں۔ کپڑے بھی کچھ تر ہیں۔ دوپٹے کے آچل سے ہاتھ پونچھتی

ہے —)

خالدہ : (غصے سے) نوکرانی مر گئی تھی۔ جو آپ ڈھیر کپڑوں کا دھونے بیٹھ گئیں۔

ابھی تو پوری طرح آپ کی کمزوری بھی رفع نہیں ہوئی — ظلم خدا کا آپ نے تو اپنے

آپ کو اتنا اگرا دیا ہے۔ نوکرانیوں کی طرح کام میں جٹی رہتی ہو — اتنے کپڑے

دھونے کی ہمت ہے آپ میں۔

امی : (افسردگی سے) اپنا کرتہ دوپٹہ دھونے لگی تھی — سلیم کی اماں ڈھیر

کپڑوں کا اٹھالائی۔ اب کیا جواب دیتی ہیں — کیسے دیتی — بیٹی —

تم ہی بتاؤ — گھر کی فضا پہلے ہی کیا کم خراب ہو رہی ہے جواب دیتی تو جانے کتنا

بڑا جھگڑا کھڑا ہو جاتا —

خالدہ : ہو جاتا تو ہونے دیتیں — (پھینکارتی ہے) آپ کو تو نوکرانی سمجھتی

ہیں جیسے —

امی : (افسردگی سے) ان کے در پر جو پڑی ہوں خالده بیٹی — اب تو سلیم

بھی کھنچا کھنچا رہنے لگا ہے۔ کئی بار تو مجھ سے جھڑپ ہو چکی — تو تو نادان ہے

ہی کہاں ہے — کوئی اور ساس ہوتی تو دن میں تارے دکھا دیتی۔

خالدہ: (رونے لگتی ہے)

ساس: رورو کر سچی ہو جا — ماں بیٹی کو یہ کام خوب آتا ہے۔

اماں: نہیں۔

ساس: چپ رہو جی — تمہیں اسی دن کے لئے یہاں بلایا تھا۔ حکم، حکمرانی، تنہاری ہو گئی — مجھے تو بے کار سمجھ کر الگ کر کے رکھ دیا۔

اماں: اے بہن! تمہارا گھر تمہیں مبارک — میں تو لاکھ بار خالہ سے کہہ چکی — کہ مجھے واپس جانے دے۔

ساس: دو کپڑے کیا دھونے کو دیئے قیامت کھڑی ہو گئی۔

خالدہ: دو کپڑے؟ آپ کو خیال نہ آیا۔ کہ اماں ابھی کمزور ہیں۔ مائی کس مرض کی دعا ہے — کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی — آپ نے اسے اتنا سر ٹپڑا رکھا ہے۔

ساس: وہ میری ملازمہ ہے — جیسے میں کہوں گی ویسے کرے گی۔ ہاں — خالہ: اتنا منہ لگاتیا: میں آپ اسے — اسی لئے تو چوری بھی کرنے لگی ہے۔

گھی — چینی — دودھ —

ساس: ہاں ہاں۔ لگا لے اس پر الزام — یہی تو کرے گی تو اب — کھلا پیا دیا اماں کو — نام دھردیا نوکرانی کا —

خالدہ: (زور سے) امی جی —

ساس: میں اندھی تو نہیں — سب کچھ دیکھتی ہوں — تو یہ نہ سمجھ، کہ میں کچھ جانتی نہیں — اب لگی اور پر سے رعب ڈالنے — ہونہر۔ بیماری کے بہانے۔

خالدہ: خدا کا خوف کھائیں امی جی۔

امی: (رونے لگتی ہے) خالہ چپ ہو جا تو — ابھی سلیم آجائے گا۔ بات خواہ مخواہ بڑھ جائے گی —

خالدہ: (رو کر) اماں — اتنا بڑا الزام — چوری نوکرانی کرے اور نام آپ

کا لگے — سلیم آتے ہیں تو ساری بات کھل جانا چاہیئے۔

ساس: (ہاتھ ہلا ہلا کر) رورو کر سچی ہو جائے گی۔ مارے جوتے میرے سر پر۔ حکم حکمرانی تو تیری ہی ہے — (باہر سے سلیم کی آواز آتی ہے۔ ساس زور زور سے رو ہانسی آواز میں کہتی ہے) میں تو جنم جلی زندہ رہ گئی نا حق — وہ مر گئے تھے — میں بھی مر جاتی — بہو کی ٹھوکریں کھانے کو زندہ رہ گئی — زور زور سے رونے لگتی ہے۔ آنسو نہیں ہیں لیکن دوپٹے سے برابر پونچھ رہی ہے۔ خالہ اور اماں ہراساں ہو کر اسے دیکھنے لگتی ہے — سلیم کے اندر آنے کی صدا — آتی ہے)

ساس: آگیا ہے سلیم — سکھا پڑھالے اسے — نکال دو مجھے گھر سے۔

خالدہ: امی جی — آپ کو ہو کیا رہا ہے — کیا کہہ دیا ہے میں نے۔ بات خواہ مخواہ بڑھائے جا رہی ہیں — میں اتنے دنوں سے آپ کا رویہ دیکھ کر بھی چپ تھی۔ لیکن آج — آج —

ساس: آج مار میرے سر میں جوتا — بیٹے سے بھی بے عزتی کروالے۔ ماں سے بھی — ہائے — اس زندگی سے تو مجھے موت آجائے۔ (سلیم اندر آتا ہے ماں رونے لگتی ہے —)

سلیم: (غصے میں بھڑک کر) کیا ہوا۔ آج پھر وہی بک بک —

خالدہ: پہلے بات تو سن لیجئے —

ساس: جھوٹی تو میں ہی ہوں — تم ماں بیٹی تو سچی ہو — بیٹا — تو کچھ نہ کہہ انہیں — برا بھلا مجھے ہی کہہ ڈال — کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا ان کا۔

امی: نہیں بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی — معاملہ بڑھا دیا تم نے۔

ساس: (بیٹے کی طرف دیکھ کر) دیکھ لے — اسی لئے تو میں کچھ بولتی نہیں تھی — جانتی تھی — جھوٹا مجھے ہی کریں گی۔ (رونے لگتی ہے) اپنے سر پر ہاتھ رکھ بین کے انداز میں) میں تو مر رہی جاؤں تو اچھا ہے — مجھے تو یہاں سے کہیں تبھیج دے بیٹا — ماں جائے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی۔ نہیں

تو نوجو بیٹا ہی کے پاس بھیج دو —  
 خالدہ : آپ نوجو بیٹا کے پاس جاسکتی ہیں ، لیکن خالدہ کی ماں یہاں —  
 سلیم : ( بات کاٹ کر غصے سے ) تمہاری زبان بہت دراز ہو گئی ہے خالدہ ۔  
 میرے سامنے اس گستاخی سے کلام کر رہی ہو میری ماں ہے ۔  
 ساس : ہائے ہائے — تو نے دیکھا ہی کیا ہے — بیٹی تو بیٹی ، ماں  
 بھی جینے نہیں دیتی ۔

سلیم : ( اماں سے ) آپ کو کچھ تو احساس ہونا چاہیئے — میں آپ سے  
 کس طرح پیش آتا ہوں ۔ اور آپ —

امی : بیٹا —

خالدہ : آپ تو —

سلیم : چپ رہو تم — گھر کیا ہے جہنم بن گیا ہے — میں پرسکون ماں  
 چاہتا ہوں — ایسی بک بک کا میں عادی نہیں ہوں — سمجھیں — ( پیر  
 پختا کمرے سے نکل جاتا ہے — ساس بھی فاتحانہ انداز میں خالدہ کو دیکھ کر  
 کمرے سے نکل جاتی ہے ۔ خالدہ اماں کے گلے سے لپٹ جاتی ہے — دونوں  
 رونے لگتی ہیں )

خالدہ : تم واپس چلی جاؤ اماں — تم واپس چلی جاؤ — سارا عتاب  
 تمہاری وجہ سے ہے اماں — تم واپس چلی جاؤ ۔

امی : میں تو پہلے ہی یہ کہتی تھی میری بچی — ( دونوں روتی ہیں )

— چ —

( خالدہ کا کمرہ — اماں کا سامان بندھا پڑا ہے ۔ ایک سوٹ کیس ایک  
 گھڑی — خالدہ پلنگ پر بیٹھی رو رہی ہے ۔ اماں دل گرفتہ ہے ۔ سلیم خاموش  
 کھڑا ہے — اماں اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتی ہے )  
 اماں : میں تمہارا احسان عمر بھر نہ بھولوں گی بیٹا —  
 ( سلیم نام نام سا نظر آتا ہے )  
 ( مانی اندر آتی ہے — )  
 مانی — تانگہ آگیا بہو بیگم ۔

( اماں حسرت سے ادھر ادھر دیکھتی ہے — خالدہ اٹھ کر ماں کے گلے  
 سے لپٹ کر رونے لگتی ہے ۔ اماں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلتے ہیں —  
 بیٹی کے سر کو چومتے ہوئے روتی آنکھوں سے دعائیں دیتی ہے )

اماں : خدا تجھے ہمیشہ آباد رکھے بیٹی — میرے یہاں رہنے سے جو تلخیاں  
 پیدا ہوئیں ۔ انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا — میں نہ کہتی تھی ۔ ہر چیز کا اپنا  
 ٹھکانا ہوتا ہے ۔ ہر فرد اپنے مقام پر ہی بھلا لگتا ہے —

خالدہ : ( روتے ہوئے ) اماں — اماں —

اماں : ( سلیم سے ) میری بچی کی خطائیں درگزر کرنا بیٹے — تم نے خلوص اور  
 محبت سے مجبور کیا تھا ورنہ — میں — اپنا مقام جانتی ہوں — اب

یہی دعا کرنا — مجھے بیماری نہ آئے — موت آجائے —  
 خالده : (ترپ کر) اماں — اماں — میری اماں !  
 (سلیم نادم ہو کر سر جھکا لیتا ہے ۔ مائی سامان اٹھا کر  
 لے جاتی ہے)  
 (ماں بیٹی گلے لگ کر روتی ہیں)

## لوچھ

متوسط طبقے کا ڈرائنگ روم — سیما اپنے بھائی اور بھابی کے ہمراہ بیٹھی ہے  
 بھائی کے ہاتھ میں خط ہے ۔ جسے ایک بار پڑھنے کے بعد اب دوسری دفعہ پڑھ رہا  
 ہے ۔ سیما اداس اور پریشان ہے آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں ۔ بھابی کچھ نیراری  
 نظر آتی ہے ۔ لیکن زمانہ سازی ہے — شوہر کے سامنے متفکر نظر آنے کی  
 کوشش کرتی ہے)

بھائی : (خط میز پر ڈال کر) اتنا ظلم — راشد انسان نہیں درندہ ہے  
 سیما : (رو دیتی ہے) ہائے میری رشتی باجی ۔  
 بھائی : حد ہو گئی — مہینے بھر کی بچی کو دیں — بیماری بھی اور پٹائی بھی ۔  
 سیما : نہ جانے کس حال میں ہے میری باجی — خط میں لکھا ہے مہینہ بھر سے  
 بخار آرہا ہے ۔

بھابی : آپ لوگ تو خواہ مخواہ متفکر ہو رہے ہیں ۔ خط رشتی کا تو ہے نہیں ۔  
 جانے کسی نے شرارت سے لکھ دیا ہے ۔ خدا نہ کرے جو وہ ایسی دکھی ہو ۔ راشد  
 اتنا برا بھی تو نہیں ۔

سیما : (آنسو پونچھ کر) بھابھی — خط باجی کی ہمسائی کا ہے ۔ اسے  
 جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی ۔ باجی ضرور بیمار ہیں اور راشد بھائی — آواز  
 گھٹ جاتی ہے)

بھابی : بھئی سوچنے کی بات ہے ۔ مہینے بھر سے رنشی بیمار ہوتی ۔ تو ہمیں اطلاع نہ دیتی —

سیما : میں باجی کی عادت سے واقف ہوں بھابی — وہ سارے دکھ اپنی جان پہ جھیل جاتی ہے ۔

بھابی : تم تو خواہ مخواہ دہم کر رہی ہو — رنشی کی شادی کو چوتھا سال جا رہا ہے ۔ کبھی اس نے کوئی شکایت کی ہے ؟ خوش باش آتی ہے خوش باش چلی جاتی ہے ۔ بھائی : تم نہیں سمجھتی شکیدہ — رنشی بڑی صابر لڑکی ہے ۔ راشد کے متعلق مجھے بہت کچھ پتہ چلا ہے ۔ وہ آوارہ اور بد قماش آدمی ہے ۔ چار سال سے رنشی اس سے نباہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے ۔ رنشی یہاں آتی ہے ۔ ہنستی مسکراتی ہے ۔ لیکن میں نے اس کی ہنسی میں ہمیشہ غم کی ٹھنڈک محسوس کی ہے ۔ اس کی مسکراہٹ میں دکھ کا دباؤ اتنا واضح ہوتا ہے ۔ کہ چھپائے نہیں چھپ سکتا ۔ (سیما رونے لگتی ہے) میں جانتا ہوں ۔ اس کی زندگی مسلسل عذاب ہے ۔

بھابی : (بیزاری سے) ہائے بیچاری رنشی ۔

سیما : اندر ہی اندر گھلتی رہیں ۔ کمزور تو پہلے ہی اتنی ہو رہی تھیں ۔ اس پر بخار بھی آنے لگا ہے ۔ ہائے اندھ میری باجی روتی ہے (بھائی جان — رنشی باجی کا کیا ہوگا؟

بھائی : (ملاؤمت سے) نہ روسیما — میں رنشی کو یہاں لے آؤں گا — (بھابی کے چہرے پر بیزاری کے واضح آثار نظر آتے ہیں) رنشی بے سہارا نہیں ہے ۔ جو جبر و استبداد کے بیچے میں دبوچنے کو چھوڑ دی جائے ۔ اس کا بھائی زندہ ہے — سیما : ماں باپ کے بعد ہمیں آپ ہی کا سہارا ہے ۔ بھائی جان (بچکیاں)

بھابی : ہلکی روتی کیوں ہے — بڑا بھائی باپ ہی تو ہوتا ہے — تم دونوں بھی مجھے کو کو اور جی کی طرح عزیز ہو ۔

سیما : بھائی جان !

بھائی : میں آج رات ہی کی گاڑی سے چلا جاؤں گا ۔ نہ جانے بے چاری رنشی کس حال میں ہے ۔ ادھ — میری بد نصیب بہن —

بھابی : (جلدی سے) ہاں ہاں جا کر اس کا پتہ تو کرنا چلا بیٹے — خدا کرے کہ یہ خط جھوٹ ہی ہو ۔ اور رنشی اپنے گھر اچھی بھلی ہو ۔

سیما : (سرنفی میں ہلا کر) خط جھوٹ نہیں ہے بھابی — رنشی باجی کی یہ ہمسائی جس نے خط لکھا ہے ۔ بڑی ہی نیک اور خدا ترس عورت ہے ۔

بھائی : (خط اٹھا کر بلند آواز سے پڑھتا ہے) رنشی کو مہینے بھر سے بخار آ رہا ہے صبح سے شام تک کو لہو کی طرح کام میں جتی رہتی ہے ۔ اس پر بھی بس نہیں ۔ ہر وقت کی پٹکار کالی گلوچ — اب تو چند دنوں سے راشد مار پیٹ پر بھی اتر آیا ہے ۔ ظالم نے کل اس قدر پٹائی کی — کہ —

سیما : (روتے ہوئے) بس کیجئے بھائی جان بس — میرا تو کلیجہ پھٹنے لگا ہے ۔

بھائی : شکیدہ تم بیگ میں میرے رات کے کپڑے ڈال دو ۔ میں آج رات کی گاڑی ہی سے رنشی کو لینے جانا چاہتا ہوں ۔

بھابی : ہائے ہائے آپ تو اتنے برہم ہو رہے ہیں ۔ صبر و ضبط سے کام لینا چاہیئے رنشی بال بچوں والی ہے ۔ آخر تو اسے وہیں رہنا ہے ۔ آپ راشد کو سمجھانے کی کوشش کیجئے گا ۔

بھائی : وہ نہیں سمجھنے کا شکیدہ — سمجھانے کی نوبت ایک دو بار نہیں کئی بار آئی — لیکن اس نے ہمیشہ الٹ اثر لیا — اب پانی سر سے ہی گزر گیا ہے کم بخت کہاں سے پلے پڑ گیا — میں نے اس رشتے کی مخالفت بھی کی — لیکن اماں ۔ خدا بخشے انہیں ، کسی کی سنتی کب تھیں ۔ مالدار لڑکا دیکھا ۔ اس کے کردار کے متعلق سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ۔

بھابی : قسمت کا لکھا ہو کہ رہتا ہے ۔ ماں باپ اولاد کے دشمن تو نہیں ہوتے

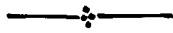
بھابی : اے ہے — آپ تو ایک کی ایک کرنے کا جیسے تہیہ کر کے جا رہے ہیں۔ (سمجھانے کے انداز میں) اگر کوئی جھگڑا ہوا تو مصالحت کی کوشش کیجئے گا۔ دو ایک دن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا معاملہ ہے۔

بھائی : میں پاگل تو نہیں شکیلہ — اسی لئے تو جا رہا ہوں۔ حالات سدھرنے کے قابل ہوئے تو خیر — نہیں تو آخری چارہ یہی ہوگا کہ اسے یہاں لے آؤں — ہمارے سوار خشی کا اور کون ہے۔ آخری سہارا ہم ہی تو ہیں۔

بھابی : (تیور بدل کر) میں کب کہتی ہوں کہ آپ اسے یہاں نہ لائیں۔ سو دغہ آئے یہاں۔ لیکن میرا مطلب تو یہ ہے کہ اس کے شوہر کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ کیجئے گا۔ جہاں تک ہو سکے۔ سمجھا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کیجئے گا۔ بیابھی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔

بھائی : بشرطیکہ گھر جہنم نہ ہو۔

(سیما ٹائم ٹیبل لے آتی ہے۔ بھائی گاڑی کا وقت دیکھنے لگتا ہے۔ بھابی کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ہیں۔)



اچھا ہی سوچتے ہیں۔  
رنجشی کے بارے میں تو اچھا نہ سوچا — اتنی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کو ادارہ اور بدچلن کے پلے بانڈ دیا۔ کوئی تیز طرار لڑکی ہوتی۔ تو شاید اس قماش کے آدمی کو ناکوں پٹنے چبواتی — رنجشی تو چپ چاپ جل جانے والی ہے۔ میں اس کی عادت کو اچھی طرح جانتا ہوں شکیلہ — کسی کو دکھ دینے کا تو وہ سوچنے کی بھی روادار نہیں۔

سیما : گلہ شکوہ تو کرنے کی عادت ہی نہیں —  
بھائی : میں جانتا ہوں — وہ شروع ہی سے گم گو اور بے ضرر سی ہے۔ مجھے یاد ہے میں ہمیشہ اس پر رعب جایا کرتا تھا۔ زیادتی کیا کرتا تھا۔ لیکن اس نے اس بات کی کبھی اماں سے شکایت کی تھی نہ اتنے بے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میری زیادتی پر بھی اسے بڑا ناان ہے۔ بڑا گھمنڈ ہے۔ بڑا فخر ہے۔ اپنے ہاتھوں میرے کام کیا کرتی تھی۔ سردیوں کی ٹھنڈی اور اندھیری راتوں میں وہ بارہ بارہ بجے تک جاگا کرتی تھی۔ میں دودھ پی کر سونے کا عادی تھا۔ وہ ہمیشہ دودھ گرم کر کے مجھے دیا کرتی۔ اکثر یوں ہوتا کہ پڑھتے پڑھتے اذیت آجاتی — وہ چپ چاپ میرے سر ہانے بیٹھی رہتی۔ جب بیدار ہوتا تو دودھ گرم کر لے رتی — کتنا پیار تھا اسے مجھ سے — اب کی مالی حالت ان دنوں کچھ اچھی نہ تھی۔ میری خاطر رنجشی نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی — اب ہم دونوں کے تعلیمی بوجھ کے تحمل نہ ہو سکتے تھے۔ کتنی بڑی قربانی ہے — مجھے بھی تو اس کے بغیر چین نہ آتا تھا — تمہیں یاد ہوگا۔ شکیلہ۔ اس کی شادی کے بعد میں کتنی مدت اس کے لئے بے چین رہا —؟

شکیلہ : جی یاد ہے۔

بھائی : (گھڑی دیکھ کر) سیما ذرا ٹائم ٹیبل تولانا۔

سیما : اچھا بھائی جان (اٹھ کر جاتی ہے)

بھائی : تم میز بیگ تیار کر دو — میں کل اسے لیکر واپس آ جاؤں گا۔

ہے۔ (الگ کر کے اس کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے)  
 رنشی: (آنسو آنکھوں میں پیتے ہوئے) نہیں بھائی جان — کوئی ایسی خطرناک  
 حالت تو نہ تھی۔ (بسنے کی کوشش میں) یونہی بخار آنے لگا تھا۔ نفی کی پیدائش  
 کی کمزوری تھی۔ آئیے — کمرے میں چلیے — بیگ مجھے دے دیجئے —  
 کیسے آنا ہوا — بھائی، سیما اور بچے اچھے ہیں نا۔

فہیم: سب اچھے ہیں۔ (بیگ دے دیتا ہے) تمہاری حالت —  
 رنشی: (لگو کو اٹھا کر) ماموں آئے ہیں لگو بیٹے۔ سلام تو کرو۔  
 فہیم: (بچے کو اٹھا کر پیار کرتے ہوئے) بیمار ہو — اور اتنے دھیر سارے  
 برتن دھو رہی ہو۔

رنشی: (آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) وہ — وہ —  
 بھائی جان ملازمہ — ہے نا — چھٹی پر ہے ان دنوں — اس لئے۔  
 فہیم: کون سی ملازمہ — جس کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔

رنشی: (فہیم کے لمحے اور تیوروں سے گھبرا کر) جی — جی —  
 فہیم: (تلخ لمحے میں) راشد کہاں ہے؟

رنشی: (بھائی کا چہرہ دیکھتے ہوئے) وہ — اندر ہیں۔ ابھی سو رہے ہیں۔

فہیم: (طنز پر) آٹھ بجے تک سویا پڑا ہے — ہونہ —

رنشی: بھائی جان — اندر چل کر بیٹھئے تو سہی — کیا — کیا بات ہے

— آپ — آپ —

فہیم: راشدرات کس وقت پر آ جاتے ہیں۔

رنشی: جی — جی — وقت پر آ جاتے ہیں۔

فہیم: شراب کتنی پیتا ہے — اور کتنی آوارہ عورتوں سے دوستی نباہ  
 رہا ہے۔

رنشی: (گھبرا کر) جی — جی —

(رنشی کا گھر اپنے متوسط طبقے کی نشان دہی کرتا ہے۔ صحن میں رنشی نلکے کے  
 قریب بیٹھی برتن دھو رہی ہے۔ بڑا بچہ دو سالہ لگو فرش پر ٹوٹے پھوٹے کھلونوں  
 سے کھیل رہا ہے۔ پلنگری پر گود کی بچی سو رہی ہے۔ رنشی کا رنگ زرد، آنکھیں  
 اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ بار بار ہلکی ہلکی کھانسی اٹھتی ہے۔ حرارت بھی محسوس ہوتی  
 ہے — بال بکھرے اور کپڑے میلے سے ہیں۔ رنشی کا بھائی فہیم ہاتھ میں بیگ  
 پکڑے ڈیوڑھی سے صحن میں آتا ہے۔ بہن کا حالت دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ  
 متغیر ہونے لگتا ہے۔ رنشی اپنی سوچوں میں گم آہستہ آہستہ برتن مانجھ رہی ہے۔ چند  
 لمحے خاموشی سے دیکھنے کے بعد فہیم آگے قدم بڑھاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں  
 کی نمی ہے —)

فہیم: (غم کی اندوہ ناک سے بھرپور آواز) رنشی —

رنشی: (سراٹھاتے ہوئے) کون؟ (بھائی کو دیکھ کر ایک لمحہ کو گنگ سی ہوتی  
 ہے۔ پھر خوشی کے ایک بھرپور جذبے سے مغلوب ہو کر) بھائی جان — آپ  
 (آنکھیں کوشش ضبط کے باوجود بھرتی ہیں — ہاتھ دھو کر آئیل سے پونچھتے

ہوئے بھائی کے قریب آتی ہے) آپ — بھائی جان —

فہیم: (فرط محبت سے بہن کو گلے سے لگاتے ہوئے) رنشی — یہ —  
 تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ بیمار تھیں تو اطلاع بھی نہ دی — پہچاننا مشکل ہو گیا



میں نہیں رہوں گی۔۔۔ یہ میرا گھر ہے۔  
 فہیم: اسے گھر کہتی ہو یہ تو جہنم کدہ ہے۔ گھر تو جنت ہوتی ہے رختی۔  
 جہاں خلوص، پیار اور محبت کی پرجائیاں بکھری ہوتی ہیں۔۔۔ یہاں تمہارے  
 لئے مسلسل جلنے والی آگ کے سوا کیا رکھا ہے۔۔۔ (بچے کو گود سے اتار  
 دیتا ہے)۔

رختی: میری تقدیر میں یہی تھا۔ (اٹھ کر کرسی کھسیٹ لاتی ہے) آپ بیٹھ  
 تو جائیے۔

فہیم: (بیٹھتے ہوئے) دو ایک دن کی بات ہوتی تو بات اور تھی۔۔۔ یہ تو زندگی  
 بھر کا معاملہ ہے رختی۔۔۔ چار سال جو تم نے اس جہنم کدے میں گزارے ہیں۔ ان  
 کی اندوہ ناک کا عکس مجھے تمہارے زرد چہرے۔۔۔ بے نور آنکھوں اور ہڈیوں  
 کے کھر کھراتے ڈھانچے میں دکھائی دے رہا ہے۔۔۔ یہ رشتہ نہیں ظلم تھا۔  
 رختی: (بھرائی آوازیں) میری قسمت میں یہی تھا۔ تقدیر کی ان دیکھی تحریریں کوئی  
 نہیں پڑھ سکتا بھائی جان۔

فہیم: ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔۔۔ خود بیمار۔۔۔ چھوٹی سی بچی گود  
 میں اور اس پر ایسی باتیں پٹائی تک سے باز نہیں آتا۔۔۔ انسان ہے یا  
 درندہ۔

رختی: (روئے لگتی ہے) بچہ ماں سے لپٹ جاتا ہے) مجھ جیسی سخت جان  
 کو موت بھی گلے نہیں لگاتی۔

فہیم: (گلوگیر آواز) مایوس نہ ہو رختی۔۔۔ میں تمہیں اس جہنم کدے سے  
 نکال کر اپنی چھوٹی سی جنت میں لے جاؤں گا۔۔۔ جہاں تمہاری شفقت بھائی  
 ہے۔۔۔ پیار کرنے والی بہن ہے۔ منے منے پھوپھو کہنے والے بھتیجے ہیں۔  
 رختی: خدا آپ کو آپ کی جنت مبارک کرے بھائی جان۔۔۔ میں اپنی بد نصیبی  
 کے تاریک سایے اس جنت پر پڑنے نہیں دوں گی۔

فہیم: مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو۔۔۔ مجھے اس کے سارے کروت  
 معلوم ہو چکے ہیں۔  
 رختی: (گھبرا کر سامنے کمرے کی طرف دیکھتی ہے) آہستہ بولے بھائی جان۔ کہیں  
 کہیں وہ۔۔۔ سن نہ لیں۔۔۔ (نقابہ سے کھڑے نہیں رہ سکتی۔

پلنگری پر بیٹھ جاتی ہے)  
 فہیم: اسے سنانے ہی تو آیا ہوں۔۔۔ مجھے خط پر یقین نہیں تھا۔۔۔ لیکن  
 تمہاری حالت جو کچھ ظاہر کر رہی ہے وہ تو اس خط میں بھی نہیں تھا۔

رختی: کس خط میں! کسی نے۔۔۔ آپ۔۔۔ کو خط۔۔۔  
 فہیم: ہاں تمہاری ہمسائی نے یہ خط لکھا (جیب سے خط نکال کر دکھاتا ہے)  
 تمہیں تو اپنے آپ پر ترس نہ آیا جو اپنی حالت کے متعلق کچھ لکھ دیتیں۔ ہاں تمہاری  
 ہمسائی کو ترس ضرور آگیا۔ تم تو شاید اس دقیانوسی خیال اور اس فرسودہ  
 روایت کی پابندی کر رہی ہو۔ کہ ڈولی آئی تھی۔ اب جنازہ ہی نکلے گا اس گھر سے  
 ہوئے۔۔۔ بے وقوف لڑکی۔

(رختی رونے لگتی ہے) رختی میں تمہیں یوں گھل کر مرنے نہیں دوں گا۔  
 میں تمہیں لینے آیا ہوں۔۔۔ تم میرے گھر میں رہو گی رختی۔۔۔ میں تمہارا

بھائی ہوں۔  
 رختی: (آنسو آنچل سے پونچھتے ہوئے) بھائی جان۔۔۔ آپ کو میرے  
 حالات کا علم ہو ہی گیا ہے!۔۔۔ میری ہمسائی نے خواہ مخواہ آپ کو  
 پریشان کیا۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ اپنی تقدیر پر شا کر ہوں بھائی جان۔  
 میرے دکھ میرے۔۔۔ میں بھائی جان۔۔۔ آپ۔  
 فہیم: رختی۔۔۔ تمہارا بھائی تمہارے دکھوں کو بانٹ لینے کا حوصلہ رکھتا  
 ہے۔ میں اسی لئے تو تمہیں لینے آیا ہوں۔  
 رختی: (دسرنفی میں ہلاتے ہوئے پرسوز آوازیں) نہیں بھائی جان۔



دی ہے۔ جو پیش آرہا ہے سہہ رہی ہوں۔ (روتے ہوئے) سہتی رہوں گی۔  
اس وقت تک — جب —

فہیم: بے وقوف نہ بنو — تیاری کرو — میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔  
اچھی ہو جاؤ گی تو بے شک واپس آ جانا —

رخشی: اچھی؟

فہیم: مایوسی کی تو کوئی بات نہیں رخشی — میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تمہیں  
میرے گھر میں سکون و آرام ملے گا۔ چند دنوں ہی میں ٹھیک نہ ہو گئیں تو کہنا —

رخشی: آپ کو میرا کتنا خیال ہے (رودیتی ہے)

فہیم: یہ میرا فرض ہے رخشی — میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔

—❖—

فہیم: تم کوئی فکر نہ کرو رخشی — ہم سب مل کر تمہاری زندگی میں گھلی ہوئی  
زہر ناکوں کو ختم کر دیں گے۔ تمہاری بھائی تمہارے لئے پریشان تھی۔ سیمانے توجہ  
سے خط ملا۔ رورو کر برا حال کر لیا تھا۔

رخشی: (سر جھکا کر آہستگی سے) سب ٹھیک ہے بھائی جان لیکن —  
فہیم: اب بھی لیکن وکین کی گنجائش ہے رخشی — میرا تو خون کھول رہا ہے۔  
— اچھا ہی ہو — جو میں راشد کا سامنا نہ کروں۔ ورنہ غصے میں کہیں ہاتھ  
پائی کی نوبت نہ آجائے۔

رخشی: (گھبرا کر) ات — نہیں بھائی جان — اپنے آپ کو قابو  
میں رکھیے گا۔ میری زندگی جیسی بھی گزر رہی ہے گزرنے دیجئے —  
فہیم: پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو رخشی — تمہیں گھل گھل کر مرنے کے  
لئے یہاں رہنے دوں — دیکھو تو حالت کیا بنا رکھی ہے — کوئی  
علاج بھی نہیں ہو رہا ہو گا۔

رخشی: (مظلوم تلخی کے ساتھ) علاج؟ (آنسو پی جانے کی کوشش کرتی ہے)  
علاج کی ضرورت ہی نہیں — اچھا ہے — جتنی جلدی یہ زندگی ختم ہو  
سکے — ہو جائے —

فہیم: رخشی!

رخشی: میں نے اپنے متعلق آپ کو کبھی کچھ نہیں بتایا تھا — لیکن میرے  
گھر کی جلتی آگ آپ نے دیکھ ہی لی — بھائی جان — اس آگ سے  
دور ہی رہیے — میں نہیں چاہتی۔ کہ یہ تپش آپ کی جنت تک پہنچ پائے۔  
فہیم: خون کے ناطے بھی تو کچھ ہوتے ہیں رخشی — تم سمجھتی ہو تمہیں اس  
حالت میں یہیں چھوڑ کر میں جین سے رہ سکوں گا۔

رخشی: آپ پر پہلے ہی سیمانے کا بوجھ کیا کم ہے بھائی جان — میں یہیں ٹھیک  
ٹھیک ہوں۔ یہیں رہوں گی — میں نے اسی لئے تقدیر کے سامنے سپرداں

فہیم : رختی یہ کیا بات ہوئی۔ ڈاکٹر نے ساری ہدایات تمہارے سامنے ہی تو دی تھیں۔ خوراک اور دوائی باقاعدگی سے لیتی رہو گی۔ تو بہت جلد آرام آجائے گا۔ رختی : سیما یونہی کہہ رہی ہے بھائی جان — آپ فکر نہ کریں — (ہلکی سی کھانسی) —

فہیم : فکر نہ کیا کرو۔ ہنسی خوشی رہا کرو تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔ رختی : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) فکر کر کے کیا کروں گی بھائی جان — انہوں نے تو گھر سے نکال دیا — اب آپ ہی کا سہارا تو ہے — وہ — گھر — تو چھٹ گیا۔

فہیم : اس جہنم اور جہنمی مردود کو یاد نہ کیا کرو رختی — یوں سمجھ لو۔ کہ اک بھیا نک خواب تھا — جو ختم ہو گیا۔ ماضی مرجاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی لاش کا بار کندھوں پر اٹھائے پھرنا حماقت ہے — اور تم — تم تو — اتنی کمزور ہو بخار رہتا ہے — کھانسی اٹھتی ہے۔ یہ بوجھ اپنے ذہن سے جھٹک ڈالو — سیما تم رختی کو باتوں میں نگٹے رکھا کرو نا۔

سیما : میری تو امکانی کوشش یہی ہوتی ہے بھائی جان — لیکن باجی ہیں کہ ہر وقت سوچوں ہی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ یا کر دٹ بدل کر آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ فہیم : رختی !

رختی : (دبڈبائی آنکھوں سے) جھوٹ کہہ رہی ہے سیما میں — یہاں کیوں رونے لگی — میں تو بڑے آرام سے ہوں — کوئی کام نہ کاج۔ سارا دن پلنگ پر پڑی رہتی ہوں۔ اور — اور — کیا چاہیئے مجھے۔

فہیم : پلنگ پر شوقیہ تو پڑی نہیں رہتیں — ڈاکٹر نے مکمل آرام کی تاکید کی ہے۔ یوں ہی غم کرتی رہیں۔ تو پاچکی صحت — رختی میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔

(رختی پلنگ پر لیٹی ہے۔ نقابہت بدستور ہے۔ ہلکی ہلکی کھانسی بار بار اٹھتی ہے۔ سیما قریب ہی مونڈھے پر رختی کی نین کی بیٹھی ہے۔ فہیم کمرے میں آتا ہے۔ ہاتھ میں پھل کا لفافہ — اور کچھ ٹیکے اور دوائیاں ہیں — کمرے کے ننگے فرش پر لگو کھیل رہا ہے۔ فہیم : کیسی طبیعت ہے اب رختی۔

رختی : (نقابہت سے) اچھی ہوں بھائی جان۔ فہیم : یہ بودائیاں سیما — انجکشن الگ کر لو — اور ٹانگ الگ۔ یہ مالے بھی رختی کے لئے رکھ دو — جوس دے رہی ہونا — سیما : بھائی جان باجی جوس پیتی ہی نہیں ہیں۔ (بچی کو پلنگ پر لٹا کر چیریں پکرتی ہے)

فہیم : کیوں؟ سیما : آپ ہی پوچھئے — میں تو جب بھی جوس نکالنے لگتی ہوں۔ منع کر دیتی ہیں۔

فہیم : کیوں رختی — تمہیں تو ڈاکٹر نے دو گلاس جوس دن میں پینے کو کہا ہے۔ دوائی بھی وقت پر پی رہی ہو یا نہیں۔ سیما : وہ تو میں دے دیتی ہوں۔ خوراک کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتی۔

چاہئے تھا۔ لیکن تمہارے اپنے اندیشوں اور سوچوں نے تمہاری صحت بحال کرنے کی بجائے اور بگاڑ دی ہے۔

رختی : (مسکرانے کی کوشش کرتی ہے) آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہونے دوں گی بھائی جان —

سیما : جھوٹا وعدہ کر رہی ہیں نا —

رختی : نہیں سیما — اب میں واقعی بھائی جان کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

فہیم : میری اچھی بہن —

سیما : بھائی جان انجکشن آج سے شروع ہونگے۔

فہیم : ہاں میں نے کمپوڈر سے کہہ دیا ہے شام کو اگر انجکشن لگا جایا کرے گا تم ٹیپر پچر تو وقت پر لے رہی ہونا —

سیما : جی ہاں — چارٹ پر جیسے آپ نے بتایا تھا لکھتی جا رہی ہوں۔

فہیم : بس ٹھیک ہے۔ دوائی وقت پر دیا کرو۔ اور خوراک کا بھی خاص طور پر دھیان رکھو — ہوں۔

ہاں تو لگو میاں، تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ آؤ جلدی بھیا کے ساتھ چل کر کھیلو —

رختی : (جلدی سے) اسے — اسے یہیں کھیلنے — بھائی جان —

فہیم : (حیران ہو کر) کیوں؟ یہاں —

(بات ختم ہونے سے پہلے بھابی اندر آ جاتی ہے۔ فہیم پیچھے سے کھیلنے لگتا ہے۔ بھابی کے چہرے پر کچھ ناگواری کے اثرات ہیں۔ لیکن جلد ہی مسکراتے ہوئے رختی سے مخاطب ہوتی ہے) پلنگ کے قریب آ کر۔

بھابی : کیسی ہواب؟ بخار ٹوٹ گیا۔

رختی : اچھی ہوں —

سیما : بخار ابھی اترا نہیں — ہر وقت حرارت رہتی ہے۔ بھائی جان —

رختی : نہ بھائی جان — ایسا نہ کیئے — آپ کے سوا — میرا

اب کون ہے (رونے لگتی ہے) — سیما بھی آج کل سے آنکھیں پونچھتی ہے۔

فہیم بے چین ہو جاتا ہے۔ رختی کے بستر پر جھک کر اسے پیار سے سمجھانے لگتا ہے۔

فہیم : رختی — بچوں کی سی عادت ہے تمہاری — رونے دھونے سے

کچھ نہیں بنے گا — اپنا حوصلہ اور ہمت برقرار رکھو۔ دیکھو تو — تمہارے

چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تمہیں ان کو پروان چڑھانا ہے۔ اس لئے صحت اور زندگی

کی ضرورت ہے۔ بخدا اپنے لئے نہیں تو ان بچوں کیلئے حالات سے نباہ کر لو۔

رختی : (آنسو پونچھ کر) کوشش تو کرتی ہوں بھائی جان — لیکن نہ جانے

— کیا محسوس ہونے لگتا ہے — یوں لگتا ہے جیسے آپ کی ہنستی

مسکراتی جنت پر میں اک جہیب سایہ بن کر منڈلانے لگی ہوں۔

فہیم : رختی — اپنی سوچ کا انداز بدل دو میری بہن۔ تمہیں میرے گھر میں

رہتے ہوئے ایسے اندیشوں کو ذہن میں جگہ نہیں دینی چاہیئے — میری مقدور

کوشش یہی ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ — لیکن تم — شاید — غیریت

کا — احساس رکھتی ہو —

رختی : غیریت نہیں — صرف — یہ احساس ہے کہ میری وجہ سے

آپ کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے —

فہیم : تمہیں اس سے کیا؟ — میں کوئی ایسا کنکال بھی نہیں ہوں۔ اور

پھر یہ سب باتیں میرے سوچنے کی ہیں رختی — تم اپنے شعور پر یہ بوجھ کیوں

اٹھائے رکھتی ہو — تمہارے بھائی کو قدرت نے بہت بڑا دل دیا ہے —

اور پھر تمہاری بھابی بھی تو پورے خلوص سے تمہیں چاہتی ہے — (سیما ناگواری

سے بھائی کو دیکھتی ہے)

رختی : (گہری آہ بھر کر) ہاں بھائی جان — وہ — میرا بڑا خیال رکھتی ہیں۔

فہیم : پھر بھی ایسی ایسی باتیں سوچتی ہو۔ مہینے بھر میں تو تمہیں رو بصحت ہو جانا

فہیم: شکیلہ! تم تو پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو — اب رخصتی کے وہاں جانے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی ہے۔ اس جہنم میں جلنے کے سوا اسے اور کیا مل سکتا ہے — (افسردہ نظر آنے لگتا ہے)

بھابی: (منہ بنا کر) کہتے تو ٹھیک ہی ہیں — مگر — خیر — آپ بڑے ڈاکٹر کو تو دکھادیں۔ اس علاج سے تو کوئی افادہ نظر نہیں آ رہا۔

فہیم: (بٹلتے ہوئے) کل اسے بھی دکھا دیتے ہیں — ہو سکتا ہے اس کی تشخیص کچھ اور ہو — اور اس کے علاج سے فائدہ بھی جلد نظر آنے لگے۔

رخصتی: نہیں بھائی جان — یہ دوائی لے رہی ہوں — (پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سیما تکیہ اس کی کمر سے لگا دیتی ہے —) یہ دوائیاں ختم تو تو ہوں — پھر دیکھا جائے گا۔ (چہرے سے پشیمندی بدرجہ اتم ظاہر ہے) جانے کتنے کی دوائیاں آچکی ہیں۔

فہیم: رخصتی — تم تو ناحق پریشان ہوتی ہو — (مسکراتے ہوئے شکیلہ کو دیکھ کر) بھئی رخصتی کو تو یہی فکر ہے کہ پسینہ خرچ ہو رہا ہے۔ پگلی سمجھتی ہی نہیں کہ تمہاری صحت کے لئے ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کیوں شکیلہ۔

بھابی: کیوں نہیں جی — مجھے تو خدا کی قسم دن کو چین ہے نہ رات کو۔ اچھا میں چلی رخصتی کا کھانا تیار کرنا ہے۔ (چل دیتی ہے سیما بڑے طنزیہ انداز میں اسے جاتا دیکھتی ہے)

فہیم: (اعتماد سے رخصتی کو دیکھ کر) تم دیکھ رہی ہونا — کتنی اچھی بھابی خدا نے تمہیں دی ہے۔ ہر وقت تمہارا ہی فکر دماغ پر مسلط ہے —

رخصتی: جی — جی — بھائی جان (سیما کے چہرے پر ناگواری سے اثرات ہیں) —

فہیم: میں ذرا بازار جا رہا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دو — سیما تمہیں کچھ منگنا ہے بازار سے۔

ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔  
فہیم: کچھ نہیں — کچھ نہیں — بس کمزوری کہتا ہے۔ رفع ہو گئی تو بخار خود بخود اتر جائے گا۔

بھابی: (ہمدردی جتا کر) اس ڈاکٹر پر تو مجھے قطعاً اعتماد نہیں۔ بس مکسچر دے دیا۔ یا انجکشن لگا دیئے۔ اور کچھ آتا ہی نہیں (فہیم سے مخاطب ہو کر) آپ سے میں نے کہا بھی تھا کہ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کو دکھادیں۔

فہیم: بھئی دکھائیں گے — ابھی کچھ دن اس کا علاج تو کر دیکھیں۔ آٹھ نو دن تو کل ہوئے ہیں علاج شروع کئے ہوئے۔

بھابی: آٹھ نو دن میں کچھ تو فرق پڑ جاتا — مجھے تو رخصتی پہلے سے بھی کمزور لگتی ہے۔ (رخصتی کا سر تھپ تھپاتے ہوئے)۔

فہیم: کھاتی پیتی کچھ نہیں۔ سیما نے بتایا۔ روتی بھی رہتی ہے۔ اب اس کا کیا علاج —؟

بھابی: (رخصتی سے) کیوں رخصتی —؟  
رخصتی: (مسکراتے کی کوشش میں) نہیں بھابی — بھائی جان یونہی کہہ رہے ہیں —

بھابی: بھئی جلدی جلدی اچھی ہو جاؤ — رہا رونا دھونا — تو اس کی کیا ضرورت ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تو ہنسی خوشی اپنے گھر چلی جانا — کوئی پابندی تو پوری ہی ہے۔

رخصتی: (آہ بھر کر) گھر؟  
فہیم: اس گھر کا اب نام ہی نہ لیا کر دے شکیلہ — ہمارے لئے راشد مر گیا۔

بھابی: آپ تو ہمیشہ الٹی ہی بات کریں گے — اس نے غصے میں گھر سے نکال دیا۔ تو اب یہ بات پہلے ہی باز دھلی۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ خدا رخصتی کا گھر آباد رکھے۔

سیما : نہیں بھائی جان ۔  
 فہیم : اچھا — تم جو س نکال کر رختی کو پلاؤ — ( چل دیتا ہے —  
 سیما منہ بنا کر میز کی طرف بڑھتی ہے ۔ مائٹے اور چھری پلیٹ میں رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ۔ )

سیما : ( بڑبڑاتی ہے ) بھابی کا دن رات کا چین — تو واقعی ختم ہو رہا ہے ۔  
 — کتنی چالاک ہیں ۔ بھائی جان کے سامنے کس طرح محبت اور ہمدردی کا مظاہر کر رہی تھیں — لیکن وہ چلے جائیں — تو کبھی کمرے میں جھانک کر بھی نہیں دیکھتیں — شادو کے لئے دو دھیلنے جاؤں تو بڑبڑ کرنے لگتی ہے ۔ ( مائٹا پھیلتے ہوئے ) لگو — جیدی کے ساتھ نظر آجائے تو ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں — سیدھے منہ بات نہیں کرتیں ۔ اور اب — کس طرح پیار — رختی : ( آواز بھری آواز ) سیما — چپ رہا کرو سیما ۔ گھر بھابی کا ہے ۔ میزا نہیں ۔ سیما : ہونٹ کہہ کر تیزی سے مائٹا پھیلتے لگتی ہے ۔ رختی تقابست سے گرنے کے انداز میں تیکے پر سر رکھ دیتی ہے ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امانڈ رہے ہیں ۔ )



( بھابی کا کمرہ — ایک طرف دو پلنگ پڑے ہیں ۔ جن پر صاف سہترے بیڈ کور ہیں ۔ دائیں ہاتھ الماری ہے ۔ اس کے ساتھ ہی دو تین صندوق اور تینے رکھے ہیں ۔ دوسری دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل ہے ۔ سامنے سٹول پڑا ہے — بائیں ہاتھ دو کرسیاں ہیں ۔ جن پر بچوں کے دھل کر آئے کپڑے پڑے ہیں ۔ بھابی جیدی کے ہاتھ پکڑے اسے پیٹ رہی ہے — چار سالہ بچہ رو رہا ہے ۔ بھابی تھپتھپ پر تھپتھ لگا رہی ہے — )

بھابی : پھر کھیلے گا لگو کے ساتھ — بول — جلدی بول — جائیگا ان کے کمرے میں — ( جھنجھوڑ کر ) میں تیری کھال اتار دوں گی ۔ اگر اب تجھے ان کے کمرے میں لگو کے ساتھ کھیلنے دیکھا تو — بچہ روئے جاتا ہے ) کتنی بار منع کیا ہے ۔ سنتا ہی نہیں — باز ہی نہیں آتا — ( تھپتھ لگا کر ) بیٹھ بھٹائے مصیبت آن پڑی — ( اپنے آپ سے ) وہ اک سیما ہی کیا کم تھی ۔ دوسری کا بوجھ بھی آن پڑا ۔ خود تو آئی ۔ ان پلوں کو بھی ساتھ اٹھا لائی ۔ ( بچہ آنکھوں میں مٹھیاں گھسا کرے روتا چلا جاتا ہے ) سیر دودھ تو اس تھپتھ کو شادو کے لئے چاہیے باوا کی کمائی جیسے ساتھ لائی ہے — ہونٹ — اور ان کو تو دیکھو — ( اٹھ کر ٹھہلتے ہوئے ) اور کچھ سوچتا بوجھتا ہی نہیں ۔ بہن کے غم ہی میں تڑپ رہے ہیں ۔ ہونٹ — بہن نہ ہوئی عرش کا تارا ہو گئی — ( بچے سے ) اے

چپ کرے گا۔۔۔ یا لگاؤں ایک اور۔۔۔ چپ رہ۔۔۔ خبردار۔۔۔ بند کر آواز (بچے کو جھنجھوڑتی ہے۔۔۔ سیما شاد کو اٹھائے اندر آ جاتی ہے۔۔۔ جلدی سے جیدی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔۔۔ بچہ پھوپھو کہہ کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتا ہے)

سیما: (بھابی کی خشک ناکی سے حیران ہو کر) بھابی کیوں مار رہی ہیں اسے۔  
بھابی: (غرا کر) چھوڑ دو اسے (بچے کو اپنی طرف کھینچتی ہے)۔

سیما: ہائے اللہ آپ تو بیچارے کو۔۔۔  
بھابی: تم چپ رہو جی۔۔۔ میں جانو اور میرا بچہ۔۔۔ ساری عادتیں بگاڑ لیں ہیں اس نے لکھوئے ساتھ کھیل کھیل کر۔۔۔ دو مہینے ہو گئے لکھو کو آئے بچہ بگڑ گیا میرا۔۔۔  
سیما: (بیچارگی سے) لکھو۔۔۔ وہ بیچارہ تو۔۔۔ ابھی ٹھیک طرح بول بھی نہیں سکتا۔ دو سال عمر۔۔۔

بھابی: (غصے سے) میں کہتی ہوں چپ رہو تم۔۔۔ بڑے پر نکل آئے ہیں تمہارے بھی۔ بہن کیا آگئی ہے۔ کسی دوسرے کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

سیما: (آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں) بھابی۔۔۔  
بھابی: (غصے سے) اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگی ہو شاید۔۔۔ ہو نہ۔۔۔ (سٹول پر بیٹھ کر بچے کا منہ صاف کرتی ہے)

سیما: (ششدر سی) میں نے کیا کیا بھابی۔  
بھابی: (سر ہلا ہلا کر طنز یہ انداز میں) تم نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔۔۔ سارا دن بہن ہے یا بہن کے بچے۔۔۔ مجھے تو لو کرانی سمجھ رکھا ہے۔ گھر کی دیکھ بھال بھی کروں اور مر لینیوں کو بھی سنبھالوں۔۔۔ پیسہ بھی خرچ کروں اور جان بھی ماروں۔

سیما: (افسردگی سے) بھابی۔۔۔ سکول سے آنے کے بعد جتنا وقت بھی

ملتا ہے۔۔۔ میں کام کرتی رہتی ہوں۔۔۔ باورچی خانے کا بھی اور دوسرا بھی۔  
بھابی: (ہاتھ چلا چلا کر) کرتی ہو۔ تو مجھ پر احسان کا ہے کا جاتی ہو۔  
سیما: (رو ہانسی ہو کر اور بچی کو کندھے سے تھپک تھپک کر) میں نے کب احسان جمایا بھابی۔۔۔ مجھے تو خود احساس ہے کہ جب سے باجی آئی ہیں کام کافی بڑھ گیا ہے۔ وہ بیمار نہ ہوتیں۔۔۔ تو۔۔۔

بھابی: (بچے کو گود میں بٹھاتے ہوئے) اب بیمار ہی سہی رہے گی وہ۔۔۔ دو ماہ ہو گئے۔۔۔ پلنگ سے پیر ہی نیچے نہیں اتر۔۔۔ آرام فرمانے آئی ہے نا۔  
سیما: (رو کر) خدا ایسا آرام کسی دامن کو بھی نہ دے۔۔۔ باجی کا بخار ہے کہ اترتا ہی نہیں۔۔۔ کھانسی ساری ساری رات چہین لینے نہیں دیتی۔ اگر وہ اچھو رہتیں تو بستر پر شوقیہ تھوڑا ہی پڑی رہتیں۔

بھابی: بات بات پر لٹوے بہانا آتا ہے دونوں بہنوں کو۔ ہو نہ۔۔۔ باورچی خانے میں جا کر کھانا تیار کرو۔

(سیما آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ بھابی بچے کو چپکارنے لگتی ہے۔ خود پیار کرتی ہے)

بھابی: لگو گندہ بچہ ہے بیٹے۔۔۔ تم اس کے ساتھ مت کھیلا کرو۔۔۔ سمجھے۔۔۔ (بچہ خوش ہو کر اچھلتے ہوئے کمرے سے نکل جاتا ہے) سوچا تھا سیما کی شادی کر کے آرام سے بے فکر ہو کر رہوں گی۔۔۔ یہ پتہ نہ تھا۔۔۔ دوسری بلا ایسی گلے آن پڑے گی۔۔۔ کہ چھٹکارے کی امید ہی نہ رہے گی۔۔۔ (کمرے میں متفکرانہ ادھر ادھر ٹہلنے لگتی ہے)

رخشی: کیا ہوا باجی۔ آپ اچھی ہو جائیں۔ بس۔۔۔ پڑھائی ہوتی رہے گی۔  
 رخشی: (فیصلہ کن لہجہ) تم سکول جاؤ سیما۔۔۔ میں بھابی۔۔۔ کو۔۔۔ کچھ  
 مدد دیا کروں گی۔

سیما: (دکھ بھرے انداز میں) آپ؛ باجی آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔  
 رخشی: سیما۔

سیما: جی۔

رخشی: بھابی نے شاید تم سے کچھ کہہ دیا۔

سیما: (جلدی سے مسکرانے کی کوشش) نہیں تو باجی۔۔۔ انہوں نے تو کچھ  
 بھی نہیں کہا۔۔۔ میں نے خود ہی محسوس کیا ہے۔ کہ مجھے انکی مدد کرنا چاہیے۔

رخشی: (دکھانتے ہوئے) جھوٹ کیوں کہتی ہو۔۔۔ میں سب سمجھتی ہوں۔  
 سیما: رخشی باجی! آپ ایسی باتوں میں دخل نہ ہی دیا کریں۔ بھابی کی تو عادت  
 بن گئی ہے۔ سارا دن بڑ بڑ کرتی رہتی ہے۔ مزاج ہی ٹھیک نہیں رہتا۔

رخشی: (رندھی آواز میں) میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں سیما۔۔۔ میں نے تو پہلے  
 دن ہی یہ سب کچھ محسوس کیا تھا۔ (رونے لگتی ہے) میں بھی کیا کروں سیما۔  
 بوجھ بن کر ان پر آن پڑی ہوں۔

سیما: باجی۔۔۔ خدا۔۔۔ رویے نہیں۔۔۔ آپ نے تو درود کر ہی اپنی  
 جان تباہ کر ڈالی۔ دن بدن حالت خراب ہی ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ میں تو اب  
 بھابی کے متعلق بھی آپ سے کچھ بات نہیں کرتی۔۔۔ آپ ناحق۔۔۔ پریشان  
 نہ ہوا کریں۔۔۔ ہمارے بھائی جان تو اچھے ہیں نا۔۔۔ کتنے دکھی نظر آتے ہیں  
 ہر وقت آپ کا فکر ہے انہیں۔

رخشی: (آنسو پونچھتے ہوئے) لیکن۔۔۔

سیما: بھابی کی باتوں کا خیال نہ کیا کریں۔۔۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں  
 بھائی جان پر کیسے جادو ڈال رکھا ہے۔ ان کے سامنے کس طرح پیش آتی ہیں۔

(آٹھ بج چکے ہیں۔ فہیم دفتر جا چکا ہے۔ لیکن سیما نفی شاد کو کوڈ میں  
 لٹے بیٹھی ہے۔ رخشی بڈیوں کا ڈھانچہ نظر آرہی ہے۔ پلنگ کے قریب میز پر دو انیاں  
 اور کچھ پھل رکھے ہیں۔ لگواں کے پلنگ پر بیٹھا کاغذوں سے کھیل رہا ہے۔  
 سیما سخت اداس نظر آرہی ہے)  
 رخشی: (کروٹ بدل کر سیما کو دیکھتے ہوئے) سیما۔

سیما: (سراٹھا کر) جی باجی۔۔۔  
 رخشی: آج تم سکول نہیں جاؤ گی؟ تیار نہیں ہو رہیں۔  
 سیما: (سر جھکا کر شاد کو دیکھتے ہوئے) نہیں باجی۔۔۔ آج میں سکول نہیں  
 جاؤں گی۔

رخشی: (حیرانگی سے) کیوں؟

سیما: چھٹیاں لے لی ہیں۔

رخشی: وہ کیوں؟

سیما: بھابی۔۔۔ اکیلے سارا کام نہیں سنبھال سکتیں باجی۔۔۔ میں ان  
 کو مدد دیا کروں گی۔ (بچی کو پچکارنے لگتی ہے) شادو اور لگو کو بھی تو  
 سنبھالنا ہوتا ہے۔

رخشی: (دکھ بھری آواز) میری وجہ سے تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔



رخستی : نہ نہ نہ — سیما — کسی دن یہ حماقت نہ کر بیٹھنا — کیوں  
اپنے بھائی کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا چاہتی ہو — انہیں — بھابی  
کے رویے کا نتیجہ چل گیا — تو بہت دکھ ہو گا۔

سیما : وہ زیادتی کرتی رہیں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں۔

نخستی: (گلوگیر آواز میں) ہاں سیمّا — ان کا حق ہے۔

سیما : زیادتی کرنے کا ؛ اخلاق بھی کوئی چیز ہے — تقدیر نے آپ کو یہاں لا ڈالا۔ اس میں آپ کا کیا قصور — ان بچوں سے وہ نفرت کرتی ہیں۔ (روہانسی بو کر) آپ کے — ساتھ کس طرح بری طرح — پیش آتی ہیں۔

رخششی: (دگری آہ — آنکھوں میں آنسو) یہ میرے نصیبوں کی کوتاہی ہے۔

سیما — بیابانی لڑکی اپنے گھر میں خوش و خرم ہو تو شفاف پانی کی وہ پھیل ہوئی ہے جس میں چاند تارے اپنا عکس دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھ جیسی بدنصیب لڑکیاں جنہیں شہروں کے گھر سے نفرت اور حقارت کے تازیانے برساکر نکال دیا جائے۔

نشیب کی طرح پہنے والے اس گدے پانی کی طرح ہوتی ہیں جو جوڑی کی صورت میں جمع ہو جاتا ہے۔ (دھیمی آواز) اور جس سے سٹرنڈ اور نقصان اٹھتا رہتا ہے۔

سیما : ( گھبرا کر ) باجی — باجی — آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ ہمارے بھائی  
جان تو خلوص رکھتے ہیں نا — وہ تو ہمیں بار نہیں سمجھتے —

خوشی : ہاں سیما — بھائی جان ہمیں بار نہیں سمجھتے — لیکن اس حقیقت سے تو انکار نہیں کہ ہم بار بھی نہیں گراں بار ہیں۔ (کھانسی اٹھتی ہے۔ سیما جلدی

پانی دیتی ہے۔ رختی ہانپ جاتی ہے)

سیما : باجی چھوڑیے ان باتوں کو — دیکھئے شادو — کتنی پیاری ہو گئی ہے۔ یا سچ ماہ کو تو کتنی ہی نہیں (شت) مثبت کر کے بچی کو اچھا لیتی ہے) دیکھیں

باجی دیکھیں۔۔۔ کتنا مہنس رہی ہے۔

رخشتی : (آنسو پونچھتے ہوئے) اسے میرے سامنے نہ ہنسیا کرو سیما۔

سیما : (حیران ہو کر) کیوں باجی؟

رحمتی : اسے جب بھی منستے دیکھتی ہوں۔ (سوچتے ہوئے ڈوبی آوازیں) تو اس کی سہیلی کے جلو سے چلتے آنسو نظر آتے ہیں۔ آہوں کے دھوئیں دکھائی دیتے ہیں۔  
بڑی ہو کر آنسو ہی بہا کرے گی مجھے یاد کرے۔

بیسما: (ٹرپ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ جاتی ہے) باجی

رہنشی : سیما — میرا شعور ان اندلیشوں سے دھندلا رہا ہے۔ جو میرے بچوں کو مستقبل میں پیش آئیں گے۔

بِسْمَا: (رونی آوان باجی آپ ایسے کیوں کہتی ہیں۔ آپ اچھی سو جائیں گی۔

رضی: اچھی؟ سیاتم ایکسرے کا نتیجہ چھپا سکتی ہو۔ ڈاکٹر کی رپورٹ پوشیدہ رکھ سکتی ہو۔ لیکن (آہ بھر کر) میرے سینے میں جلنے والی آگ مجھے میرے انجام

کی خبر دیتی رہتی ہے۔ (کھانسی) میری ————— حیات کا تانا بانا جل کر رکھ ہو رہا ہے ————— میں جانتی ہوں ————— سیما ————— سب جانتی ہوں (ہلینے لگتی ہے)

سہما : باجی (رودیتی ہے)

رضختی : جس خوفناک مرض میں میں مبتلا ہوں — اور وہ جس درجے تک پہنچ چکا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔

سیما: باجی۔ خدا کیلئے باجی۔ مایوس نہ ہو جائیے۔ ٹی بی لاعلاج نہیں ہے آپ کا علاج مکمل طور پر بہتر رہا ہے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ (دونوں خاموشی سے آنسو بہانے لگتی ہیں)۔



فہیم : تمہارا مطلب لگو اور شاد سے ہے۔  
 بھابی : اور نہیں تو کیا (مخمس ہمدردی بن کر) سارا دن اور ساری رات بچپاری  
 کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک ضد کر رہا ہے کبھی دوسرا۔  
 فہیم : ضد؟ ضد تو نہیں کرتے خاص — ہاں بچے ہی ہیں نا؛ کبھی کبھار روتے  
 ہیں۔ مچلتے ہیں۔ بس۔

بھابی : (منہ بنا کر) جی — جیسے آپ تو چوبیس گھنٹے بچوں کے ساتھ ہی تو  
 رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھئے ہو سارا دن گھر پہ رہتی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں بچوں کو  
 باپ کے حوالے کیجئے —

فہیم : (دکھرا کر) لیکن رشتی !

بھابی : (ہمدردی جتنا کر) رشتی کی جان عزیز نہیں آپ کو؛  
 فہیم : (سر جھکا کر) کیوں عزیز نہیں شکیلہ — میں تو ہر امکانی کوشش کر رہا ہوں۔  
 بھابی : اور جو بات خرابی کر رہی ہے۔ اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔ بچے  
 سارا دن تنگ کرتے ہیں۔ اور رشتی انہیں دیکھ دیکھ کر نجانے کیا سوچتی رہتی ہے  
 میں کہتی ہوں اس کی زندگی عزیز ہے تو بچوں کو باپ کے پاس بھجوا دیں۔  
 فہیم : رشتی بچوں کی جدائی برداشت کر لے گی۔

بھابی : جہنم میں جائیں بچے — سانپ کی اولاد سنپولیا ہی ہوگی۔ ہمیں تو  
 اپنی رشتی کی زندگی چاہیئے۔ (آواز رو ہانسی بنا کر) بیچاری کا کیا حال ہو گیا ہے۔  
 دیکھ کر گلیجھوٹ جاتا ہے۔ آدھی بھی نہیں رہی — ڈھانچہ بن گئی ہے ہڈیوں کا۔  
 (آنچل سے ناک رگڑتی ہے)

فہیم : (اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے) تم سچ کہتی ہو — ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔  
 بھابی : علاج کے ساتھ آرام بھی ملے تو اچھی بھی ہو جائے — اور میں  
 یقین کے ساتھ کہتی ہوں۔ جب تک بچے یہاں ہیں۔ اسے سکون ملے گا نہ آرام۔  
 فہیم : تو پھر —

فہیم اپنے کمرے میں ہے ڈاکٹر بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ بھابی  
 لپک کر اندر آتی ہے۔ فہیم پلنگ کی پٹی پر بیٹھا ہے۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر سر  
 ہاتھوں پر گر کر رکھا ہے)

بھابی : (جلدی سے) جی میں نے کہا کیا ہوا —؟  
 فہیم : (دسراٹھا کر افسردہ لہجے میں) مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا — پورا علاج سو رہا  
 ہے۔ لیکن رشتی صحت پکڑنے کی بجائے دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ یوں لگتا  
 ہے اندر ہی اندر سلگ رہی ہے — اف — میری بد نصیب بہن۔  
 بھابی : خالی علاج سے کیا ہوتا ہے اسے تو سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔  
 (آنکھیں گھما کر) سکون اور آرام کی۔

فہیم : میں اسے سکون اور آرام کہاں سے مہیا کروں شکیلہ — راشد کا دکھ تو۔  
 بھابی : راشد کیا جہنم میں — میں تو یہاں اس کے سکون اور آرام کی بات  
 کر رہی ہوں۔

فہیم : (حیران ہو کر) یہاں؟ یہاں اسے سکون اور آرام نہیں مل رہا۔ کیا؟  
 بھابی : (سرفنی میں ہلاتے ہوئے فہیم کے قریب بیٹھ جاتی ہے) خاک مل رہا ہے۔  
 فہیم : کیا مطلب؟  
 بھابی : اجی میں آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں — آپ ہیں کہ سن کر دھیان نہیں دیتے۔

مجبانی : شکر ہے۔ آخر مان ہی گئے میری بات۔ بچے تو دفغان ہو گئے۔  
 ہر وقت کی چیں چیں۔ بلاٹے گی سر سے۔ دودھ کا خرچ ہی کم نہیں۔ پھر  
 اور چیزیں۔ ہونٹ۔ ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہم نے۔ گھر نہ ہوا یتیم خانہ ہو گیا۔  
 اپنے بچوں کا حصہ کاٹ کر کس فیاضی سے انہیں دے دیتے ہیں۔ ہونٹ۔  
 میں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ ان بچوں کو گھر سے نکال کر ہی دم لائے گی۔ آج رات ہی بھوا دو ملی۔  
 (چیزیں اکٹھی کرنے لگتی ہے)

سیما : بھابی — خدا کیلئے انہیں یہیں رہنے دیں۔  
 بھابی : (غرا کر) چپ رہو — تمہاری زبان بہت کھلتی جا رہی ہے، دن بدن۔  
 سیما : (رد ہانسی) اس کمرے میں تو اباجان کے وقت نوکر رہا کرتے تھے بھابی۔  
 بھابی : (طنز یہ) تو کیا نوکر ساتھ ہی چپک گئے ہیں۔  
 سیما : بھابی ۔

ہنیم : جب سے بچوں کو بھیجا ہے۔ اس کی حالت خراب ہو گئی ہے۔

بھابی : (آنکھیں منکا کر) بھئی میں نے خود رخصتی سے اجازت لی تھی — اس نے ہی تو کہا تھا۔ کہ بھیج دو —

ہنیم : تم اس کی عادت کو جانتی ہو۔ ہر بات پر جھک جاتی ہے۔ یہ عادت نہ ہوتی تو آج یہاں اس حالت میں ہوتی؟ (کرسی کے ہتھ پر بے چینی سے ہاتھ مارتے ہوئے) میرا خیال ہے بچوں کو واپس بلا لوں۔

بھابی : (بات بدل کر) نئی دوائی لے آئے؟

ہنیم : ہاں (کوٹ کی جیب سے چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر) یہ لو۔

بھابی : (دوائی لیتے ہوئے) گولیاں ہیں۔

ہنیم : ہاں۔

بھابی : ہائے بیچاری رخصتی — چار ماہ سے دوائیاں کھا رہی ہے۔ انجکشن

لگ لگ کر تو بازو پھلنی ہو گئے۔

ہنیم : (جھک کر بوٹ کے تسے کھولتے ہوئے) فائدہ تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔

— مایوسی ہوتی ہے (سیدھے ہوتے ہوئے) ہاں یہ ڈیوڑھی والا کمرہ آج کیوں کھلا ہے۔

بھابی : (ایک دم خوش گوار انداز میں) صفائی کر وار ہی ہوں۔ رخصتی کو اس کمرے میں رکھیں گے۔

ہنیم : (حیرت سے دیکھ کر) رخصتی کو اس کمرے میں!

بھابی : ہاں جی۔

ہنیم : وہ کیوں؟

بھابی : وہ کمرہ بڑا ہوا دار ہے۔ اور الگ تھلگ بھی — رخصتی کو جس آرام کی

ضرورت ہے یہاں بالکل نہیں مل رہا — (بڑی اپنائیت سے) یہاں تو

ہر وقت بچوں کا شور رہتا ہے۔ کبھی چیزوں کے گرنے کی آواز — تو کبھی

بھابی : (الفاظ پر زور دیکر) جو میں نے کہہ دیا ہے وہی کرو۔ شام تک چیزیں لے جاؤ اس کمرے میں۔ (دانت پیس کر) گھر کو ہسپتال بنا رکھا ہے۔

سیما : (چپک کر) آپ باجی کی حالت دیکھ نہیں رہیں۔ (غصے سے) بچوں کو بھیج کر آپ کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا ابھی (منہ چھپا کر روتے ہوئے) کس قدر نڈھال ہو گئی ہیں میری باجی۔ اب اس کمرے سے نکال دیں گی تو —

بھابی : (غصے سے پیر پٹخ کر) میں دیکھ رہی ہوں تیرے تیور بدل رہے ہیں۔ اب تو مجھ سے بد کلامی پر بھی اتر آئی ہے۔ (سلاٹیاں غصے سے پلنگ پر پھینک کر) آلیں آج وہ — سب کچھ بتاؤں گی — دیکھ تو کیا حال کرواتی ہوں تیرا — سیما : میں نے کیا ہی کیا ہے بھابی — (دوسرے کمرے سے رخصتی کی آواز۔ سیما کو بلارہی ہے) آئی باجی — (جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔)

بھابی : (پھر سلاٹیاں اٹھا کر بننے لگتی ہے — وہیں کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ساتھ والے کمرے سے رخصتی کی کھانسی کی آواز آتی ہے —) کھاؤں کھاؤں — سارے جریشم — ہمارے اندر جارہے ہیں — اف میرا بس چلے تو چار پائی سمیت اٹھا کر باہر پھینک دوں۔

(ہنیم کمرے میں آتا ہے۔ پریشان نظر آ رہا ہے۔ گہری آہ بھرتے ہوئے شکیلہ کو دیکھتا ہے)

ہنیم : کیا بات ہے؟

بھابی : اوہ آپ آگئے — (اک لمحہ کو گھبرا کر) کچھ نہیں — کچھ نہیں — میں کہہ رہی تھی — کیسی کھانسی اٹھتی ہے رخصتی کے — دل ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ بیچاری رخصتی —

ہنیم : (دوسری کرسی پر بیٹھ کر) شکیلہ — رخصتی کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ بھابی : ہاں — مجھے بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔

بڑن اٹھانے رکھنے کی — وہ کمرہ الگ تھلگ تو ہے نا۔  
 فہیم: بات تو ٹھیک ہے — وہ کمرہ واقعی الگ تھلگ ہے۔  
 بھابی: گلی والی کھڑکیاں کھول دیں — تو ہر وقت تازہ ہوا ملتی رہتی ہے۔  
 جو رشتی کیلئے بہت ضروری ہے۔

فہیم: اسے عقیدت سے دیکھ کر تم رشتی کا کتنا خیال رکھتی ہو۔  
 بھابی: (اٹھلا کر) تو کوئی احسان کرتی ہوں آپ پر۔

فہیم: پھر بھی — میں تمہارا ممنون ہوں (جو تے اتار کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کوٹ اتارنے لگتا ہے)

بھابی: واہ جی ممنون ہونے کی کیا بات (خود بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے) رشتی صرف آپ کی ہی بہن تو نہیں۔ میری بھی تو ہے۔

فہیم: تم عظیم ہوشکیلیہ — ورنہ اکثر گھروں میں بھابیاں نندوں کی جان کی بیری ہوتی ہیں۔ تم بہت اچھی ہو — یہ میری خوش قسمتی ہے۔

بھابی: (نازاں ہو کر) آپ خواہ مخواہ تعریف کر رہے ہیں — میں تو کچھ بھی نہیں کرتی — ہاں رشتی کیلئے دل بڑا دکھتا ہے۔

فہیم: اب خدا ہی رحم کرے — اپنی طرف سے تو ہم کوتاہی نہیں کر رہے۔  
 (فہیم کپڑے تبدیل کرنے چل دیتا ہے — بھابی مسکرانے لگتی ہے۔ بڑی تلخ لیکن فاتحانہ مسکراہٹ لبوں پر ہوتی ہے۔)

— ❖ —

(فہیم رشتی کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتا ہے۔ دوسری طرف سے بھابی آجاتی ہے۔ فہیم بے انتہا پریشان اور افسردہ نظر آ رہا ہے۔ بھابی اسے وہیں روک کر آواز میں گھبراہٹ کا غصہ شامل کر کے پوچھتی ہے۔)  
 بھابی: کیوں؟ کیا ہوا — بڑے پریشان نظر آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے کیا؟ بتائیے نا — ابھی آیا تھا نا ڈاکٹر —

فہیم: (گہری سانس) ہاں؟

بھابی: کیا کہتا ہے؟

فہیم: (بے چینی سے) کہے گا کیا سب کچھ تو نظر آ رہا ہے۔

بھابی: (باتھ ملتے ہوئے) نظر تو واقعی آ رہا ہے — لیکن ڈاکٹر نے کوئی تسلی نہیں دی کیا؟

فہیم: (نفی میں سر ہلا کر) وہ — مایوس — ہو چکا ہے — (رو ہانسی آواز میں) لیکن رشتی —

بھابی: کچھ کیئے بھی — مجھے کیسی الجھن ہو رہی ہے۔

فہیم: رشتی سینی ٹوریم جانا چاہتی ہے۔

بھابی: (آنکھوں میں چمک) سینی ٹوریم —

فہیم: ہاں شکلیہ — وہ مصر ہے کہ اسے سینی ٹوریم بھیج دیا جائے۔

وہاں اس مرض کے بہت بڑے بڑے ماہر ہوں گے۔ کیا عجب رشتی کی صحت بحال ہو ہی جائے۔

فہیم: تم تو بے وقوف ہو بالکل۔ دیکھ نہیں رہیں اس کی کیا حالت ہے۔ اب بھی صحت کی آس لگا رکھی ہے۔

بھابی: (ردنی آواز) یہ آس تو آخری دیر تک رہے گی۔ میں تو اس وقت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہ سینی ٹوریم ضرور داخل کروادیں صحت تو نہ رہے گی۔ کہ یہ چارہ نہ کیا۔

فہیم: اب تم کو کیسے سمجھاؤں؟

بھابی: سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ سینی ٹوریم میں داخل کروانے کا دو ایک دن میں بندوبست کریں۔ بس۔

فہیم: (رندھی آواز) شکیلہ اب دوا نہیں دعا کی۔ ضرورت ہے۔

بھابی: میں مایوس نہیں ہوں۔ خدا مردے میں جان ڈال دیتا ہے۔ وہ تو ابھی زندہ ہے۔ آپ تو ناحق ایسی مایوسانہ باتیں کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ داخل کرواد کیجئے۔

فہیم: تم کہتی ہو۔ تو یہ حیلہ بھی کر دیکھتے ہیں۔ (آہ بھر کر) لیکن میں جانتا ہوں کہ فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔

بھابی: ہمت کیجئے۔ حوصلہ ہارنے سے کچھ نہیں ہوگا۔

فہیم: جب رشتی کو دیکھتا ہوں۔ تو۔۔۔ دل بیٹھنے لگتا ہے۔

شکیلہ: ہر وقت دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ دیے کی ٹمٹاتی نو۔ کاکیا اعتبار۔ کس وقت ہوا کا جھونکا آئے اور بچھا کر گزر جائے۔ (گہری آہ)

بھابی: مایوسی گناہ ہے گناہ۔ آپ نے تو حد ہی کر دی۔ اور۔ اپنا حال کیا بنا رکھا ہے۔ جانیئے نہادھو کر کپڑے تو تبدیل کر لیجئے۔

بھابی: بیچاری۔۔۔ سن رکھا ہوگا۔ سینی ٹوریم سے ٹی بی کے مرضی شفا یاب ہو کر نکلتے ہیں۔

فہیم: (گہری آہ) ہاں۔ شاید ہی خیال آیا ہوگا۔

بھابی: تو۔۔۔ پھر داخل کروا۔۔۔ ہی دیں۔

فہیم: شکیلہ! پاگل ہو تم بھی۔ (صرت سے) اب اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ سینی ٹوریم لے جانے کو۔ (دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرالیتا ہے) رشتی۔

میری بد نصیب بہن۔

بھابی: (اس کا ہاتھ پکڑ کر) آپ تو خواہ مخواہ حوصلہ ہار بیٹھے۔ خدا مالک ہے۔ کیا عجب سینی ٹوریم جا کر صحت اچھی ہو ہی جائے۔ مایوسی گناہ ہے۔ جب تک سانس تب تک آس۔

فہیم: (آنسوؤں سے رندھی آواز) رشتی۔ ختم۔ ہو۔ چکی ہے۔ صرف سانس۔ کاناٹ۔ باقی ہے۔ شکیلہ۔ میں اس زندہ لاش کو سینی ٹوریم۔ کس لئے لے جاؤں۔

بھابی: (ہمدردی سے) آپ تو تاریک پہلو ہی دیکھیں گے ہمیشہ۔ میں کہتی ہوں اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ چلو۔ رشتی کی خواہش ہے اسے اس کی خواہش سمجھ کر ہی پورا کر دیں۔ چھ ماہ سے یہاں علاج ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ وہاں ہی سہی۔ وہ دل میں کیا سوچے گی۔ اس کی خواہش کا آپ کو خیال رکھنا چاہیئے۔ سینی ٹوریم ضرور داخل کروادینا چاہیئے۔

فہیم: آہ بھر کر، بے فائدہ۔

بھابی: پھر وہی۔ میں کہتی ہوں۔ آپ اس کی آخری خواہش سمجھ کر بوری کر دیں۔

فہیم: (ہونٹ کاٹ کر ہاتھ ملتے ہوئے) جانے رشتی کو کیا سوچھی؟ بھابی: مایوس ہو کر یہیں عافیت نظر آئی ہوگی۔ آپ ضرور داخل کروادیں۔

فہیم : شکلیہ — میرا تو کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔  
 بھابی : حوصلہ رکھیے۔ حوصلہ رکھیے — خدا مالک ہے۔  
 فہیم : اتنی مدت ہو گئی۔ علاج معالجے میں تم تو جانتی ہی ہو۔ کوئی کسراٹھانہیں  
 رکھی۔ پھر بھی — قدرت کو جانے کیا منظور ہے —  
 بھابی : سب ٹھیک ہے۔ آپ سینی ٹوریم لے جانے کا بندوبست کریں میرا دل  
 کہتا ہے رختی وہاں ٹھیک ہو جائے گی۔  
 (فہیم گہری آہ بھر کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔  
 بھابی کھڑی سوچتی رہتی ہے)

— ❖ —

(رختی کا کمرہ — پلنگ پر لاش سی پڑی دکھائی دیتی ہے۔ سیما پائنتی کی  
 طرف بیٹھی اس کے پاؤں دبا رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔ رختی  
 باتیں کر رہی ہے۔ کھانسی کا دورہ پڑتا ہے۔ بے حال ہو کر تکیے پر سر رکھ  
 دیتی ہے۔)

سیما : آنسو آچل سے پونچتے ہوئے (با — جی —  
 رختی : (ہانپتے ہوئے) ہاں — سیما — کیا ہے ؟ (آواز ٹوٹ ٹوٹ  
 جاتی ہے) روکیوں رہی ہو۔  
 سیما : (روتے ہوئے) باجی — آپ نے کیوں بھائی جان کو سینی ٹوریم جانے  
 کو کہا — میں آپ کو کبھی جانے نہ دوں گی —  
 رختی : (نقاہت سے) پگلی — سینی ٹوریم سے اچھی — جگہ اور کونسی  
 ہوگی — (کھانسی) سینی ٹوریم کے ٹھنڈے — درو دیوار — سسکتی  
 زندگیاں کو — پناہ دیتے ہیں۔

سیما : باجی — باجی — آپ کیوں ایسے کہتی ہیں۔  
 رختی : (کھانسی — پھر ہانپتے ہوئے) سیما — رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔  
 میری بہن تم دیکھ نہیں رہیں — موت — کتنی سرعت سے میری طرف  
 بڑھ رہی ہے۔ لیکن — میں — میں — سینی ٹوریم جانا چاہتی

ہوں۔ کس لئے۔ جانتی ہو۔؟

سیما: باجی!

رضشی: صحت یاب ہونے کی امید پر نہیں سیما۔ موت سے گلے ملنے کے لئے۔

سیما: (روتے ہوئے، باجی۔

رضشی: (کھانستے ہوئے) میں وہاں۔ آلم سے مرکوں گی۔ سیما۔

سیما: باجی۔ خدا کیلئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔

رضشی: سینی ٹوریم۔ مدقوق۔ چہرے۔ کھوکھلے ڈھانچے۔ بے نور آنکھیں۔ خالی سپنوں سے اٹھتی ہوئی جگر ہلا دینے والی کھانسیاں۔ (کھوکھلی منہسی منہستی ہے)

سیما: باجی۔ باجی۔

رضشی: (آواز تقاہت سے ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے، آہ۔ میرے نیچے۔ گلو شادو۔ سینی ٹوریم۔ میں۔ تو۔ انہیں دیکھنے کی اجازت ملے گی نا۔ (کھانسی کا شدید دورہ)

سیما: (رضشی کا سینہ سہلاتے ہوئے، باجی۔ باجی۔ کیسی باتیں کر رہی ہیں ہوش میں آئیے۔ باجی پانی لیں گی۔ باجی۔

رضشی: گلو۔ ٹرکا ہے۔ حالات۔ جیسے بھی ہوں گے۔ کسی طور نباہ کرے گا۔ لیکن شادو۔ میری مظلوم بچی۔ کاش۔ میرے ساتھ تو بھی مر جاتی۔ کسی پر بوجھ تو نہ بنتی۔ کون۔ کون اٹھائے گا تیرا بوجھ۔ میری۔ معصوم۔ شادو۔ آہ۔

سیما: باجی (روتے ہوئے، باجی۔ میری طرف دیکھئے۔ خلاؤں میں کیا دیکھ رہی ہیں۔

رضشی: سینی ٹوریم۔ یم۔ سینی۔ ٹور۔ یم۔

سیما: باجی۔ ہم آپ کو نہیں بھیجیں گے سینی ٹوریم۔ بھائی جان کبھی نہیں بھیجیں گے۔ وہ۔ کبھی نہیں جائیں گے۔

رضشی: ان کے نہ چاہنے سے۔ کیا ہوگا سیما۔ بھابی۔ بھائی۔ بی۔

سیما: میں جانتی ہوں باجی۔ بھابی یہی چاہتی ہیں۔ (دسکیاں لے کر)

ان کے دل میں تو رحم کی رُمق بھی باقی نہیں رہی۔ آپ ہی نے منع کیا۔

ورنہ۔ میں بھائی جان سے سب کچھ کہنے کو تیار تھی۔ انہیں بھی تو پتہ چلتا۔

رضشی: بھائی جان۔ کی پریشانیوں۔ میں اضافہ کر کے۔ تمہیں خوشی ہوتی؟

سیما: اسی لئے تو سب کچھ سہہ لیا۔ لیکن آپ نے۔ باجی۔ اس سے ایسا روگ لگالیا۔

رضشی: (بات کاٹ کر) میری۔ تقدیر میں یہی تھا۔ سیما۔ بد نصیبی۔

غالب آتی ہے۔ تو۔ کہیں پیچھا نہیں۔ چھوڑتی۔ آگ۔

آگ جلا۔ ڈالتی ہے۔ شوہر کے گھر۔ میں یہ آگ۔ ظاہر تھی۔

شعلے۔ تپش۔ چنگاریاں۔ یہاں بھی۔ وہی آگ تھی سیما۔

فرق صرف یہ تھا۔ کہ تھنڈی آگ نظر نہ آئی۔ جلائے گی۔ آہ۔

بھابی۔ ان کا رویہ۔ ان۔

سیما: باجی۔

رضشی: میری۔ بہن۔ رد۔ رو کر ہلکان۔ نہ ہو۔

سیما: باجی۔

رضشی: میں۔ سینی ٹوریم۔ مقرر جاؤں۔ گی۔ سیما۔ زندگی کی جو۔ ساعتیں۔ باقی ہیں۔ وہ۔ وہ اس ٹھنڈی آگ سے دور گزریں گی۔ (کھانسی کا شدید دورہ۔ ہانپتے ہوئے کھانستی ہے۔



کھانسن کھانسن کر ہانپتی ہے — سیما سیما دار بہن پر تصدق ہے —  
کسی طور کھانسنی رکتی ہی نہیں — گھبرا گھبرا کر رشتی کو پکارتی ہے — رشتی کی  
سانسیں غیر ہموار ہونے لگتی ہیں —

سیما: (پچخ کر) با — جی —  
رشتی: (ٹوٹے الفاظ) بھ — بھا — ٹی — جا — ن — کو —  
بلا — لو — (کھانسنی) — سینٹی — ٹو — ریم — جانے —  
سے — پہلے — ہی کام — بن گیا — بھا — بی — کو مبارک  
— دو — مبارک — دو —

سیما: (پچخ کر بہن سے لپٹ جاتی ہے) با جی —  
(سیما کی چچنیں سن کر فہیم ننگے پاؤں بھاگا آتا ہے — پیچھے پیچھے بھابی بھی  
ہے — فہیم رشتی — رشتی چیختا دیوانہ وار بہن کا سر بازوؤں میں لے کر لپک  
پر جھک جاتا ہے — رشتی کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں — سیما ٹرپ رہی ہے —  
— اور — بھابی — کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈھل آتے ہیں —  
جانے سر سے بوجھ اٹھ جانے کی خوشی سے — یا بد نصیب رشتی کی جواں مرگی  
کے احساس سے) ÷

— ÷ —

## ماہ رخ

رکیم کے کی آنکھ کھلتی ہے۔

یہ گو لکندہ کے سابق وزیر اعلیٰ میر حیدر جیسے میر جلد بھی کہا جاتا ہے کی  
صاحب زادی ماہ رخ کی شکار گاہ ہے۔ سورج کی تیز کرنیں ہرے بھرے  
درختوں کے ٹھنڈے سایوں سے الجھ رہی ہیں۔ ہوا مستانہ روی سے چل  
رہی ہے۔ کیلوں کی کنواری مہک سبزے کے پھوٹتے شباب سے مٹتا  
رہی ہے۔ نیلے آسمان کے جھکے کناروں پر آوارہ بادل ایک معمور سی  
انگڑائی لے رہے ہیں — صاحب زادی اپنی عزیز دوست اور رشتہ  
کی بہن افشاں کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آرہی ہے۔ اس کے  
پیچھے چند خادماہیں اور نوجوان کینیریں تیرکمان اٹھائے آرہی ہیں۔ حسن و  
جمال کا پیکر ماہ رخ مضحکہ اور افسردہ ہے۔ درختوں تلے چاک وچو بند  
گھوڑے بندھے ہیں — سب یہاں آکر رک جاتی ہیں — سنبیل  
تیرکمان لیے آگے بڑھتی ہے —

سنبیل: بسم اللہ کیجئے باؤ —

ماہ رخ: دبیزاری سے تیرکمان ہٹاتے ہوئے بہتر ہے ہم واپس لوٹ چلیں۔



ماہِ مَرُخ: بیمارے بابا—خود تو شراروں کے رقصاں چکروں میں گھرے ہیں۔ زندگی نے کتنے نوکیلے اور زہرناک تیران کے بوڑھے سیلے میں پوہست

وہ تو کیئے، حسد اور بغض کی بھینٹ چڑھ گیا۔

نادرہ: (رادب سے) جانے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے باؤ۔

ماہ رخ: جانے والے تو لوٹ کر نہیں آتے۔ لیکن دن کے جانے کے

بعد پس ماندگان کی زندگی اندھیروں کا سفر تو بن جاتی ہے نا؟

افشاں: نہیں ماہ رخ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ تمہارا انداز فکر منفی ہے اسی

یہ تو میں تمہارے متعلق فکر مند ہوں۔ شجاع مر گئے۔

ماہ رخ: (ربات کاٹ کر) مر نہیں مروا دیے گئے۔

افشاں: ہاں مروا دیئے گئے۔ ظلم کے لمبے ہاتھوں نے عدل و انصاف کی گردن دبوچ

لی۔ لیکن ان کی موت اندھیروں پر منبج نہیں ہوتی۔ اس موت

سے وہ شعاعیں بھوکتی ہیں جس سے مستقبل کی راہیں منور ہو سکتی ہیں۔

اک ظالم اور مکار حکمران نے شجاع کو بہانے کی آڑ لے کر مروا ڈالا۔ وہ

شجاع کی شجاعت، بہادری اور ہر دلعزیزی سے ہراساں تھا۔

اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا تختہ الٹ کر شجاع کو لکندہ کی ریاست کی حکمرانی

نہ حاصل کر لیں۔ لیکن وقت کی سزا سنگین ہوتی ہے ماہ رخ شجاع کے

توں کی ایک ایک بوند انتقام کی آگ بن چکی ہے، بابا نے وزارت

سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ بابا ہر وقت ایک ہی بات سوچتے رہتے ہیں۔

ایک ہی بات۔ قطب شاہ۔ والی گو لکندہ سے انتقام لینے

کی بات۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے پُر عزم بابا ایک نہ ایک دن

اس عیاش اور جابر بادشاہ کو کسی نہ کسی وسیلے سے ختم کر کے رہیں گے۔

ماہ رخ: ہاں۔ میں بابا کے عزم سے آگاہ ہوں۔ انہوں نے اپنے

بیٹے کے توں کے انتقام کی قسم کھا رکھی ہے۔ تم جانتی ہو۔ وہ ننگی

زمین پر سوتے ہیں۔

سنبل: ہاں آٹا ننگی زمین پر سوتے ہیں۔

افشاں: میں جانتی ہوں۔ اپنے آپ پر جبر و سختی انہیں ان کے عزم کے استحکام

کا احساس دلاتی ہے۔ اسی لیے تو میں پُر امید ہوں کہ شجاع کے

خون کی بوندیں شمعیں بن کر روشن ہوں گی۔ ظلم و تلذذ کا یہ دور ختم ہو کر اک

نیا سورج طلوع ہوگا۔ قطب شاہ اک والی کا نام نہیں۔ جبر و استبداد کے دور

کا نام ہے ماہ رخ۔ شجاع کا خون زمین پر بہ کر جو لکیریں کھینچ گیا

ہے وہ لکیریں نہیں تاریک گوشے سے نورانی منزل کو راستے ہیں ماہ رخ۔

ہمیں اپنے بھائی کی موت پر فخر کرنا چاہیئے نازاں ہونا چاہیئے اس لیے

کہ وہ اک تاریک دور کو ختم کرنے کا باعث بنے گا۔

ماہ رخ: (متاثر ہو کر) واقعی افشاں تم سچ کہہ رہی ہو۔ میں نے تو اس رخ

سے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

افشاں: سچائی اک اٹل حقیقت ہے ماہ رخ۔ اس کا وجود دب نہیں سکتا

۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ گو لکندہ کے مقدر کی سیاہیوں کو مٹانے کا کام

ہمارے ذمے آ لگا۔ میری روح، میرا جسم، میرا دل، میرا دماغ سچائی

کو اجاگر کرنے میں بابا کا مدد و معاون ثابت ہوگا۔ کیا تم اپنے آپ کو اس

فرض سے نیٹنے کا اہل نہیں پاتیں۔ تم ماضی کو بھول جاؤ ماہ رخ۔

حال کو دیکھو اور مستقبل کی متلاشی رہو۔

تمہارے سارے غم منتشر ذروں کی طرح پھیل کر اپنی شدت کا احساس کھو دیں

گے۔ تم اک نئے دلو لے۔ اک نئے عزم سے جینے کے سہارے تلاش

کر لو گی۔

ماہ رخ: یہ حقیقت مجھ پر آج منکشف ہوئی ہے افشاں۔

افشاں: شکر ہے۔

ماہ رخ: تم اب مجھے کبھی شاکی اور گلہ گزار نہ پاؤ گی افشاں۔ میں ثابت کر دوں گی۔

کہ میں آپنی فیصل کی طرح مضبوط اور چٹان کی طرح اٹل فیصلہ رکھنے والے

باپ کی بیٹی ہوں — جیالے اور بہادر بھائی کی بہن ہوں۔

افشاں: دو دھیرے سے مسکرا کر خدا کرے تم ایسا کر سکو — یقین مانو تم نے سولے اور ہمت کا یوں ثبوت دیا۔ تو بابا اپنے مقصد کے حصول میں ڈٹ جاؤ گے۔ وہ بہت جلد اپنے سیٹنے کی بھڑکی آگ کو ٹھنڈا کر لیں گے۔ ان کا دھبیان صرف ایک ہی طرف ہو گا۔ اب تو — اب تو تمہیں متفکر و پریشان دیکھ کر مجھے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ اپنی ساری قوت، ساری ہمت تمہیں خوش دیکھنے میں صرف کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو — وہ اپنا انہماک تو وجہ تم پر اس حد تک مرکوز کر دیں کہ ان کے قدموں تلے سے خون کی لکیروں سے بنے راستے مٹ جائیں۔

ماہ رخ: ایسا نہ سوچو۔ ایسا نہ کہو۔ میں نے وعدہ کیا ہے نا — کہ میں اب شجاع کی یاد کا سوگ اس اہتمام نہ مناؤں گی۔ بلکہ اس سوگ سے وہ شاعریں ڈھونڈوں گی جو شعلے اور شرارے بن کر ظلم پر ٹوٹ پڑیں۔ لاؤ میرا تیرکمان رافشاں تیرکمان بڑھا دیتی ہے۔ کینیزس شاداں نظر آتی ہیں۔ افشاں کے چہرے پر سکون و اطمینان کی لہریں نظر آتی ہیں۔ تیرکمان سنبھال کر ماہ رخ اپنے سفید گھوڑے کی طرف بڑھتی ہے۔ باقی سب بھی اس کی تقلید کرتی ہیں۔

دشکار گاہ کا غربی حصہ — جہاں جہاں دارپودے درختوں کے تنوں سے الجھے ہیں۔ خود رو بھاڑیاں بے تکیے پن سے بڑھتی پھیلتی چلی گئی ہیں۔ کہیں خاردار الجھاؤ ہیں کہیں خود رو گھاس — پانچ سات گھوڑے درختوں تلے کھڑے ہیں۔ ماہ رخ، افشاں اور کینیزس ایک دوسرے کو استہمایہ نظروں سے دیکھ رہی ہیں —

افشاں: میرے خیال میں نادرہ کی نظروں نے دھوکہ کھایا۔ تیرا بیگیاں ہی گئے۔ سنبھل: نہیں بانو — میں نے بھی ان بھاڑیوں میں کوئی چیز سرکتی دیکھی تھی۔ ماہ رخ: میرا نشانہ خطا نہیں جاسکتا۔

افشاں: لیکن دشکار کے آثار تو کہیں دور دور بھی نظر نہیں آتے۔

ماہ رخ: انہی بھاڑیوں یا ان کے عقب میں دشکار ٹھنڈا ہو گیا ہو گا — تھا ضرور کچھ نہ کچھ۔ تیر میں نے یونہی نہیں چلا دیا تھا۔

کینیزس: تلاش کرتے ہیں۔ ان بھاڑیوں کے پرلی طرف دیکھتے ہیں۔ افشاں: تو چلو ڈھونڈو — کوئی تیر کوئی بیڑ — زیادہ ہوا تو کوئی جنگلی ریچھ مل ہی جائے گا۔ شیر مارنے سے تو رہیں محترمہ۔

ماہ رخ: (مسکرا کر) اگر شیر ہی مارا ہوا تو — افشاں: تو میں تعجب اور حیرانگی سے فوراً غش کر جاؤں گی۔

ماہ رخ: اب تو میں اپنے شکار کو ضرور تلاش کروں گی — تم غش کھانے کی تیاری کرو۔

افشاں: وہ ہو ایسی خود اعتمادی۔

ماہ رخ: کیوں نہیں — آؤ ہم اس طرف جھاڑیاں ہٹا کر دیکھتے ہیں۔ سنبل نادرہ تم سامنے جاؤ — ساولی اور کرن تم دائیں ہاتھ۔ اور دو کینزوں کی طرف منہ کر کے، تم ہمارے واپس آنے تک گھوڑوں کے پاس ٹھہرو۔

دکینزیس مؤدبانہ اثبات میں سر ہلا دیتی ہیں۔ افشاں اور ماہ رخ درختوں کے پودوں، ٹہنیوں اور جھاڑیوں سے الجھاؤ بشکل بٹاتے ہوئے آگے بڑھنے لگتی ہیں۔ دونوں مشتاق نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔

افشاں: (سکرا کر) بانو بہتر ہے واپس لوٹ چلیں۔

ماہ رخ: مذاق نظر انداز کرتے ہوئے کان کھڑے کرنے کے انداز میں افشاں کو دیکھتی ہے، ٹھہرا افشاں۔

افشاں: کیا ہے؟

ماہ رخ: کچھ سرسراہٹ سی ہو رہی ہے۔

افشاں: (کان لگا کر سننے کی کوشش کرتی ہے) واقعی۔

ماہ رخ: (کچھ اتراتے ہوئے) دیکھانا — کچھ تو مار ہی لیا۔

افشاں: شیر نہ ہوا تو جنگلی بلی تو ضرور ہی ہوگی۔ آؤ آگے بڑھیں — ادھر سے آواز —

ماہ رخ: ربات کاٹ کر، سننا ذرا افشاں — آواز — آرہی ہے۔ آگے بڑھتی ہیں)

افشاں: ہاں ہاں — ٹھہرو — ذرا رک کر سنو — اے — یہ — تو —

ماہ رخ: (رک کر) یہ تو کسی کے کراہنے کی آواز ہے — افشاں: زخمی جانور مختلف آوازیں — آگے بڑھے جاتی ہیں۔ کراہنے کی مدہم آواز

ماہ رخ: نہیں نہیں ماہ رخ یہ تو — کوئی انسانی آواز لگتی ہے —

دو دولں تیزی سے جھاڑیاں پھلانگتی ہیں — ماہ رخ غامی بٹواس نظر آتی ہے۔ کراہنے کی آواز صاف اور قریب ہوتی جاتی ہے،

ماہ رخ: (رک کر) کوئی زخمی تڑپ رہا ہے۔

افشاں: (پریشانی سے) ہاں ماہ رخ آواز دائیں سمت سے آرہی ہے۔

ماہ رخ: (گھبرا کر) میرا تیر کسی انسان —

افشاں: ضروری نہیں کوئی تیر ہی سے زخمی ہوا ہو۔

ماہ رخ: کوئی سمت اذیت میں ہے جلدی کرو۔ اس تک پہنچیں۔

افشاں: لیکن یہاں اس وقت آیا کون؟

ماہ رخ: شکار گاہ کا کوئی رکھوالا ہو سکتا ہے۔

افشاں: آج تو یہاں کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں۔

ماہ رخ: تم باتیں بنائے جاؤ گی — جلدی جلدی ادھر آؤ — اب تو آواز

صاف آرہی ہے۔

افشاں: (لاس کے شانہ بشانہ آگے بڑھتے ہوئے) وہ — وہ سامنے دیکھو اس

درخت کے پیچھے کوئی — انسان ہی ہے ماہ رخ — لباس —

سے — تو —

ماہ رخ: (گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے) اُف میرے خدا —

افشاں: تیز قدم اٹھاؤ — (گھبراہٹ سے) جلدی آؤ۔

(ماہ رخ اور وہ بھاگ کر پہنچتی ہیں۔ ایک خوب رُونوجوان زمین پر

تڑپ رہا ہے۔ تیر اس کے پہلو میں پیوست ہے خون — چمکتا تازہ

زخمی : (خوبصورت مسکراہٹ جس کے جلو میں زخم کی اذیت ہے) ماہ رخ ماہ —  
ہ — ر — خ زخمی کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں)

ماہ رخ : (افشاں کو جھنجھوڑ کر) کچھ نوکرو افشاں — یہ — بیہوش ہو رہا ہے  
— کہیں —

افشاں : تم اس کی بنض پر ہاتھ رکھو — زخم پر کوئی کپڑا —  
ماہ رخ : (بات کاٹتے ہوئے) میں اپنا دوپٹہ رکھ دیتی ہوں۔ تم بھاگ کر کینیزوں  
کو آواز دو — ہائے اللہ — جلدی جاؤ۔ کچھ تو کرو۔

افشاں : اچھا — تم اس کا خیال رکھو — میں کچھ کرتی ہوں (دبھاگتی ہے)  
ماہ رخ : زخمی کے خوبصورت چہرے کو دیکھتی ہے) یا خدا — اسے پچالینا۔  
یہ بے گناہ میرے تیرے ہلاک ہو گیا تو — تو میرا ضمیر مجھے مار  
ڈالے گا۔

زخمی : (بشکل آنکھیں کھول کر) ماہ — رخ — میں — میں —  
ماہ رخ : اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی ہمت مجتمع کیجئے —  
آپ مر نہیں سکتے —

زخمی : (دھنڈی اور دھبی مسکراہٹ لبوں پر پھیل جاتی ہے) — میں —  
خوش قسمت ہوں — (آواز نقاہت سے ٹوٹ جاتی ہے) آنکھیں  
بند ہو جاتی ہیں —

(ماہ رخ اس کا چہرہ ہلاتی ہے۔ اس کی بنض ٹوٹتی ہے۔ پریشانی  
کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی ہے — اچانک درختوں کے جھنڈے سے  
اک سرگوشی ابھرتی ہے۔)

مردانہ آواز : عادل !

ماہ رخ : (کچھ خوف زدہ پھر ہمت کر کے) کون ؟ — جو کوئی بھی ہے بخدا ادھر  
آئے۔ اک انسانی جان جا رہی ہے۔ اک زخمی مر رہا ہے۔

اور جان دار خون بے دریغ بہہ رہا ہے۔ لباس سے نوجوان حیدر آبادی روستا  
میں سے لگتا ہے —

ماہ رخ : یا خدا — میرا تیر !  
افشاں : تمہارا تیر ہی اسے لگا ہے۔ آؤ میری مدد کرو۔ یہ تیر کھینچ کر نکال تولیں۔  
زخمی : اودہ — اُف —

(رکنا پنتے ہاتھوں سے دونوں تیر کھینچ کر باہر نکالتی ہیں۔ ماہ رخ  
بید پریشان اور حواس باختہ نظر آ رہی ہے۔ افشاں بھی گھرائی ہوئی ہے  
زخمی نکلتی بند ہوتی آنکھوں سے اپنے اوپر پھکی نوجوان لڑکیوں کو دیکھتا  
ہے۔ نقاہت سے وہ بے جان ہوا جا رہا ہے — تیر نکلنے پر بشکل  
لب ہلاتا ہے۔)

زخمی : شکریہ — (آواز مدہم اور کمزور ہے)  
ماہ رخ : خون بہت بہہ گیا ہے افشاں — اسے کسی طرح حکیم جی کے خیمے میں  
پہنچانا چاہیئے۔ کہیں یہ مرنے جائے — (حواس باختہ سی ہو کر) یہ کہیں  
مرنے جائے۔ اُف اللہ۔

افشاں : تم ذرا اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ انسا پریشان نہ ہو — کچھ سوچنے دو۔  
اسے خیمے تک کیسے لے جائیں — (گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے) —  
زخمی : (زٹ پٹھنڈی ہوتی جاتی ہے) — آنکھیں منہ صی جاتی ہیں —  
لب لرزتے ہیں۔ کوشش کر کے وہ ماہ رخ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا  
ہے — آپ ؟

افشاں : (گھبراہٹ میں) یہ ماہ رخ ہیں۔ صاحب زادی ماہ رخ ریاست کے سابق  
وزیر اعلیٰ کی بیٹی —

ماہ رخ : آپ کے میرا تیر لگا ہے — اف خداوند! — آپ کیسے میرے  
تیر کی زو میں آگئے زخمی پر جھک جاتی ہے — آپ — آپ —

ایک اجنبی ایک ہی جست میں بھاڑیاں پھلانگ کر آجاتا ہے اس کی نظر ماہ رخ پر پڑتی ہے — پھر وہ زخمی کو دیکھتے ہی چیخ اٹھتا ہے۔ زخمی پر جھک کر بے اختیار سا ہو جاتا ہے —  
اجنبی: عادل — عادل تمہیں کیا ہو گیا عادل۔

ماہ رخ: دریں اثنا کچھ حواس پر قابو پالیتی ہے (انہیں تیر لگا ہے۔ خون بہت بہہ گیا ہے۔ انہیں جلدی سے جراح کے خیمے تک لے چلیے۔  
اجنبی: ماہ رخ کو دیکھتے ہوئے مہذب انداز میں، خاتون — آپ؟ میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کس خاتون سے شرف ہم کلامی حاصل ہے۔  
ماہ رخ: میں گوکنڈہ کے سابق وزیر اعلیٰ میر حیدر کی بیٹی ماہ رخ ہوں یہ میری شکار گاہ ہے۔

اجنبی: اوہ — معاف فرمائیے گا — یقین مانیے ہمیں راستہ معلوم نہ تھا۔  
ماہ رخ: اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ انہیں خیمے تک لے چلیں ویرانہ صیر ثابت ہو سکتی ہے۔

اجنبی: میرا دوست —  
ماہ رخ: بخدا دیر نہ کیجئے — ہمارے گھوڑے کچھ ہی فاصلے پر بندھے ہیں انہیں اٹھا کر گھوڑے تک لے چلیے۔

راجنبی جھک کر عادل کو دونوں ہاتھوں پواٹھا لیتا ہے۔ ماہ رخ کا خون آلود دوپٹہ زخمی کے سینے پر ہے —

رہنائی فرمائیے —

آئیے —

(دونوں آگے پیچھے چلتے ہیں)۔

(سابق وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ — بیرونی سمت کا ایک کشادہ اور روشن کمرہ خوبصورتی اور نفاست سے سجا ہوا ہے۔ محرابی دروں پر ریشمی پردے لہرا رہے ہیں۔ زمین پر ارغوانی قالین ہے۔ مرمری مجسمے محرابی دروں کے قریب ایستادہ ہیں۔ کمرے کے ایک طرف مسندنا مسہری ہے جس پر ریشمی بستر اور کنوَاب کے چمکتے ٹیکوں کے سہارے زخمی دراز ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر جھک آئے ہیں۔ سینے پر پٹیاں بندھی ہیں۔ ریشمی چادر سے اس کا وجود ڈھکا ہے۔ اس کے سر ہانے مرمری میز پر کچھ پھول پڑے ہیں۔ چند نفرتی نظروف ہیں۔ جن میں کوئی مشروب ہے۔ دائیں ہاتھ نشست پر زخمی کا دوست مراد مسر نہوڑائے بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی مترشح ہے اور وہ گھبرا گھبرا کر اپنے زخمی دوست عادل کو دیکھتا ہے۔ جس کے لب کبھی کبھی بے نام سی لرزشیں پیدا کر رہے ہیں — محرابی دروں کے بالمقابل ایک مسند پر سابق وزیر اعلیٰ تشریف رکھتے ہیں۔ وہ بھی خاصے پریشان نظر آ رہے ہیں۔ صبح طلوع ہو چکی ہے۔ ایک کینز دیدہ زیب رنگین لباس کی سربراہیں بکھرتی ہاتھوں میں بلوریں پیالے میں دودھ لیے اندر آتی ہے جھک کر آداب بجالاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ زخمی کے قریب جاتی ہے —)

میر حیدر: ہمیں تم سے بھی زیادہ پریشانی ہے۔ عادل کو خدا نخواستہ کچھ ہو گیا۔ تو میری بچی کا ضمیر اسے کچھ دے دے کر مار ڈالے گا۔

کینئر: رات بھر اسی بات سے پریشان رہی ہیں کہ ان کے ہاتھوں کسی بے گناہ کی زندگی ختم نہ ہو جائے۔

مراد: آپ انہیں تسلی دیجئے نا۔۔۔۔۔ قصور ان کا تو نہیں۔۔۔۔۔ اگر خدا نہ کرے عادل کو کچھ ہو بھی گیا۔ تو انہیں اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ محض تقدیر کا چکر ہو گا۔

میر حیدر: میری بچی ضرورت سے زیادہ حساس ہے مراد۔۔۔۔۔ شجاع کی موت نے تو اس کا شیرازہ حیات بکھیر کر رکھ دیا ہے۔۔۔۔۔ شجاع کے مرنے سے پہلے تو وہ انتہائی لاپرواہ سی لڑکی تھی۔

مراد: شجاع!

میر حیدر: (گہری آہ بھر کر) شجاع میرا ایک ہی بیٹا تھا مراد۔

مراد: وہ۔۔۔۔۔ وہ فوت ہو گئے۔ کیا؟

میر حیدر: نہیں۔۔۔۔۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ آپہیں سیٹنے سے ٹکراتی ہیں۔ نگاہیں خلا میں جم جاتی ہیں)

مراد: آپ شجاع کی موت کا ذکر کر رہے تھے۔ (حیران ہو کر میر حیدر کی طرف دیکھتا ہے) ابھی آپ نے یہی کہا نا۔۔۔۔۔

میر حیدر: وہ مرا نہیں مروایا گیا تھا۔

مراد: اُف۔۔۔۔۔ کس ظالم نے آپ کا گلستانِ حیات تاراج کر دیا۔

میر حیدر: والہی گو لکھنڈہ قطب شاہ نے۔

مراد: جی؟

میر حیدر: تم ریاست کے رہنے والے بے شک نہیں۔ لیکن قطب شاہ کی کہانیاں تو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہیں۔ اس کی عیاشی اور مکاری

کینئر: انہیں ابھی تک ہوش نہیں آیا۔

مراد: پریشانی کے عالم میں، نہیں۔

کینئر: صاحب زادی صاحبہ بہت پریشان ہیں آقا۔ وہ رات بھر جاگتی رہی ہیں۔

میر حیدر: ماہِ رخ بہت زیادہ حساس ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی ہے۔

مراد: یہ صاحب زادی صاحبہ کے جذبات کے تقدس کا ردِ عمل ہے ورنہ ان کا کیا قصور۔۔۔۔۔ تقدیر عادل کو ان کے تیر کی زد میں لے آئی۔

میر حیدر: عجیب ہی اتفاق ہے مراد۔۔۔۔۔ جو آپ لوگ شکار گاہ کے، اس حصے میں جا پہنچے۔ ورنہ ہماری بیٹی جب شکار کے لیے جاتی ہیں۔ تو یہ شکار گاہ کسی مرد کے سایے کی متحمل نہیں ہوتی۔

مراد: میں آپ کی نوازش اور ذرہ نوازی کا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔ آپ نے ہماری غلطی کو معاف فرمایا۔ اور کل سے عادل کی دیکھ بھال کرنے میں دن رات کی قید کی بندش بھی توڑ دی۔

میر حیدر: ہمارے آقا عظیم انسان ہیں۔

زخمی کی دیکھ بھال اور نگہداشت ہماری ذمہ داری ہے مراد۔ یہ تم پر احسان ہے نہ عادل پر۔۔۔۔۔ یہ میری بیٹی کے تیر سے زخمی ہوئے ہیں۔ لہذا یہ ذمہ داری اب ہمارا فرض بن گئی ہے۔

مراد: میں دلی طور پر آپ کا احسان مند ہوں (زخمی کی طرف دیکھتے ہوئے) کاش انہیں جلد ہوش آجائے۔۔۔۔۔ ابھی تک ہوش آنے کے کوئی آثار ہی نہیں۔

میر حیدر: حکیم صاحب پرامید ہیں۔ آج سہ پہر تک انہیں ضرور ہوش آجائے گا۔ خون بہہ زیادہ بہہ جانے کے علاوہ گرنے سے گردن پر بھی کچھ ضرب آئی ہے۔۔۔۔۔ ویسے حکیم صاحب مایوس نہیں۔

مراد: خدا کرے یہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔



ہوئی ہے کہ تم بھی اس عیاش حکمران سے نفرت کرتے ہو۔ مجھے تو یوں لگا ہے۔ جیسے میرے تمہارے راستے ایک ہیں۔

مراد: (کھانس کر آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر محصومیت کا اظہار کرتے ہوئے) میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔ آقا۔

میر حیدر آقا نہیں بابا کہو۔۔۔ خدا نے تمہیں بلا مقصد نہیں بھیجا بیٹے۔ بابا کہو بابا۔

واد: بابا راتھ کر بابا سے لپٹ جاتا ہے۔

میر حیدر: (بیمد متاثر) اب میری مشکلیں بہت جلد آسان ہو جائیں گی مراد۔ میں سمجھوں گا شجاع کی جگہ خدا نے دو بیٹے دے دیے۔ تم اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لو گے نا۔

مراد: ضرور بابا۔

میر حیدر: والی کی خون میں تڑپتی ہوئی لاش دیکھنے کو میری بوڑھی آنکھیں بچپن

ہیں۔ میرے سینے میں انتقام کے الاؤ جل رہے ہیں مراد۔ میرا شجاع۔۔۔ میرا کھوتا بچہ۔۔۔ رجوئی مسرت سے جیسے پاگل

ہوا اٹھتا ہے۔ بے اختیار مراد کو لپٹا لیتا ہے (لیکن اب۔۔۔ اب مجھے کوئی غم نہیں۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔ شجاع کا انتقام لو گے نا؟)

اور عادل بھی اس کا انتقام لے گا۔ آف میں آج کتنا خوش ہوں۔ کتنا خوش ہوں۔ میں ماہِ رخ کو بناتا ہوں۔ ماہِ رخ کو بناتا ہوں۔

(اپنے بھاری لباس کو لہرانے ہوئے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ مراد کچھ حیران۔۔۔ کچھ ششدر ہلتے پردے کو دیکھتا رہتا ہے)۔

کینئر: (آنچل سے آنسو پونچھ کر) بیچارے آقا۔۔۔ کسی وقت تو یوں لگتا ہے جیسے دماغی توازن برقرار نہیں رہا۔۔۔ انتقام لینے کو توڑ پٹے رہتے ہیں۔

مراد: نوجوان بیٹے کا صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

زبان زد عام ہے۔ جس حکمران کے حرم میں ہزاروں رقاصائیں ہیں۔ جو دن رات شراب کے نشے میں مدہوش رہتا ہے۔ اس کے چرچے تو دور دور تک پھیلے ہیں۔ کیا تمہارے سننے میں نہیں آئے۔

مراد: جی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اس کی عیاشی، جبر و استبداد، ظلم و ستم کے چرچے عام ہیں۔ مجھے ایسے حکمران سے نفرت ہے۔

میر حیدر: (راتھ کر بتیابی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) کیا واقعی تم اس سے نفرت کرتے ہو۔

مراد: کوئی صاحبِ بصیرت انسان ایسے حکمرانوں کو پسند نہیں کرتا۔

میر حیدر: پھر تو تم۔۔۔ تم۔۔۔

مراد: جی؟

میر حیدر: کیا عادل ہی تمہارا ہم خیال ہے۔ (بے تابی مجنونانہ ہو جاتی ہے) نوجوان! کیا عادل؟

مراد: جی وہ مجھ سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہے۔ ریاست میں سیاحت کے شوق میں آئے تھے۔ لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر جی چاہتا ہے۔

میر حیدر: کیا جی چاہتا ہے؟

مراد: کہنے کی جرات نہیں۔ قطب شاہ آپ کے حاکم ہیں۔ کہیں سماعت پر بار نہ ہوں میری باتیں۔

میر حیدر: اوہ۔۔۔ صاحبِ زادے۔۔۔ تم میری رونماد سے آگاہ نہیں ہو تم نہیں جانتے کہ قطب شاہ میرے بیٹے کا قاتل ہے اور بیٹے کا بے گناہ

خون میرے ارد گرد پھیلی ہوئی آگ بن چکا ہے۔ میں دن رات اس میں جل رہا ہوں۔ میں جب تک اس ظالم حکمران سے بدلہ نہ لے لوں گا،

میں جین کی نیند نہیں سو سکتا۔۔۔ رجذبات میں آواز زندہ جاتی ہے۔ آنکھوں سے جیسے آگ ابلنے لگتی ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی



کینئر: بیٹا بھی تو لاکھوں میں ایک تھا۔ گو کندہ کا جیالا سپوت دشمنوں کیلئے برق گراں دوستوں کی روح — آہ کتنی خیریاں تھیں ہمارے آقا زادے میں۔

مراد: قطب شاہ کو اس سے کیا دشمنی تھی —؟

کینئر: قطب شاہ کے حرم کی ایک مجبور و بے بس رقاصہ نے مدد کے لیے ہمارے آقا زادے کو پکارا — وہ حرم کی اس گھناؤنی زندگی سے تنگ آ چکی تھی — وہ اس قید بے جا سے چھٹکارے کی خواہاں تھی۔

مراد: شجاع نے اس کی مدد کی!

کینئر: وہ اس سے شادی کر کے اس کی گناہ آلود زندگی کی — اس کی داغدار زندگی کی تطہیر بھی کرنا چاہتے تھے — لیکن معاملہ بڑھ گیا — ظلم کے ہاتھوں نے خفیہ و انصاف کا گلا دبا دیا۔

مراد: بڑی زہرہ گداز داستان ہے۔

کینئر: (راز داری سے) یہ تو مروا ڈالنے کا بہانہ تھا — اصل بات —

مراد: (بے تاب سے) اصل بات کیا تھی؟

کینئر: قطب شاہ کو ڈر تھا کہ شجاع اس کی حکومت کا تختہ پلٹ کر خود حاکم نہ بن بیٹھے — ان کی شجاعت، دلیری اور غوام میں مقبولیت ہی ان کی موت کا سبب بن گئی۔

مراد: کتنا ناروا ظلم ہے۔

کینئر: آفا کی حالت تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ صاحب زادی صاحبہ کی جان کے تو ہمیں لالے پڑ گئے تھے۔ دونوں میں پیار بھی تو بہت تھا — رزخی کی طرف دیکھ کر چونک جاتی ہے، ان کے لب ہل رہے ہیں۔ شاید — شاید ہوش میں آ رہے ہیں۔

مراد: جلدی سے اٹھ کر عادل پر جھک جاتا ہے — ہلتے لبوں سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے۔ —

کینئر: (جھک کر) کچھ کہہ رہے ہیں۔

مراد: (زیر لب مسکرا کر) بیہوشی میں بھی خواب دیکھ رہا ہے شاید۔

کینئر: کیا مطلب؟

مراد: (مسکرا کر پھر عادل پر جھک جاتا ہے) — اس کی آواز اب مدہم۔ لیکن صاف ہے،

رزخی: ماہ — رخ — ماہ — رخ — (کینئر مراد کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہے)

مراد: عادل ہوش میں ہونا — آنکھیں کھولو — دیکھو — میری طرف دیکھو نا —

(عادل کی پلکیں اٹھتی گرتی ہیں۔ مراد اس کے ہونٹ پانی سے تر کرتا ہے۔ کینئر بلورین پیالہ مراد کے قریب لے کر کھڑی ہو جاتی ہے)

ماہ رخ: (بہ زاری سے) افشاں تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جب مجھے کوئی پریشانی ہو تو بھوک قطعاً نہیں لگتی اور میری پریشانی سے تم آگاہ ہو۔

افشاں: یہ پریشانی تم نے خواہ مخواہ ہی اپنے حواس پر مسلط کر رکھی ہے۔  
ماہ رخ: وہ — وہ — اگر مر گیا۔ تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کروں گی۔

افشاں: وہ میرے تیرے زخمی ہوا ہے — اتنا شدید زخمی۔ کہ اتنا وقت گزرنے پر بھی اسے ہوش نہیں آیا۔ (دل تمام کر) خدا جانے کیا ہو جائے۔ افشاں — میرا ضمیر —

افشاں: (پریشان ہو کر سر تعام لیتی ہے) ماہ رخ خدا کے لیے ہمت سے کام لو۔ وہ بچ جائے گا۔ حکیم صاحب پر امید ہیں۔

ماہ رخ: خدا کرے افشاں — خدا کرے وہ بچ جائے۔ اگر وہ مر گیا۔ تو۔  
افشاں: وہ تو مرتا مرے گا — تم — غم میں گھل گھل کر ضرور جان سے جاؤ گی۔

ماہ رخ: میں کیا کروں — جب خیال آتا ہے کہ میرے ہاتھوں اک بے گناہ کا قتل ہوا ہے۔ ایک انسانی زندگی کا ضیاع ہوا ہے تو میری روح لرز جاتی ہے۔ افشاں — پریشانی کی انتہا — افشاں روعا کرو۔ خدا مجھے قائلہ ہونے سے بچالے۔ قائلہ۔ اف — قائلہ۔

افشاں: (چڑھ سی جاتی ہے) پیش از مرگ داویلا — کہہ دیا ہے وہ نہیں مرے گا نہیں مرے گا — نہیں مرے گا۔

ماہ رخ: (آن سنی کر کے) خدا جانے کس گھرانے کی روشنی ہے وہ۔ کس ماں کے دل کا سکون، کس باپ کا پیار اور کس بہن کا دلارا ہے۔ شجاع کی موت نے جانتی ہونا کس طرح۔ ہمارا گلشن حیات تاحات و تاراج کر دیا ہے۔ ہمارے زخمی دلوں سے بددعاؤں خود بخود نکلتی ہیں۔ ہم اپنے بھائی کے قاتل کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں — کیا — کیا

ماہ رخ کی نشست گاہ — کمرہ رنگہ۔ زور کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ پردے قالین فالوس میز پر میزیں — خوابیدہ مجھے غریب کرے کی ہر چیز افناست اور خوبصورتی لیے ہوئے ہے۔ ماہ رخ ایک مسند پر تنگیوں کے سہارے نیم دراز ہے۔ چہرے کی پھسکی رنگت اور آنکھوں کی سرخی شب بیداری کی غماز ہے۔ اس نے خوبصورت لباس پہن رکھا ہے۔ لیکن قدرے لاپرواہی سے — اس کے سامنے چاندی کے ظروف میں کچھ پھل اور کھانے کی چیزیں پڑی ہیں۔ افشاں اپنے گھیر دار لباس پر چڑھری دوپٹہ اوڑھے اس کے بالمقابل بیٹھی ہے —

افشاں: تھوڑا سا کھا لو — تم نے رات سے ایک دانہ منہ میں نہیں ڈالا۔ نصیب دشمنان بیمار ہو جاؤ گی۔ میری اچھی بہن! چند قاشیں سیب ہی کی لے لو۔ (طشتری اٹھا کر بڑھاتی ہے)

ماہ رخ: (طشتری ہاتھ پرے ہٹا دیتی ہے) افشاں مجھے بھوک نہیں۔ کینہ کو بلا کر یہ سب چیزیں توشہ خانے میں بھجوا دو۔

افشاں: کچھ بھی نہیں کھاؤ گی۔

ماہ رخ: (نفی میں سر ہلا دیتی ہے)

افشاں: میری خاطر بھی نہیں۔

ایسے ہی جذبات کسی ماں بہن اور باپ کے دل میں میرے لیے پیدا ہو جائیں گے۔

افشاں: کہہ تو رہی ہے۔ ٹھیک ہے — زیادہ ہی تردد ہے۔ تو خود جا کر احوال پرسی کرناؤ۔

ماہ رخ: (خوش نظر آتی ہے) اب میں تمہارے مذاق سے نپٹ لوں گی۔ میری جان میں جان آئی ہے۔ میری روح سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ شکر ہے خدا کا وہ پنج گیا۔

کینئر: اللہ — آپ نے کتنی پریشانی دیکھی۔

افشاں: وہ تو دم سادھے آرام وہ لیٹر پر پڑا تھا۔ نازا اٹھوا رہا تھا۔ ادھر رات ہم پر بھاری تھی۔ محترمہ نے خود سونے کی زحمت گوارہ فرمائی نہ ہمیں اجازت بخشی — اف تکان سے بُرا حال ہو رہا ہے اپنا۔

ماہ رخ: (مسکراتے ہوئے) آرام فرمائیے جنابہ —

افشاں: اب تو میں ڈٹ کے سوؤں گی — تمہارا کیا ارادہ ہے؟  
ماہ رخ: میں تو شکرانے کے نوافل ادا کروں گی۔ صدقہ بانٹوں گی۔ خیرات کروں گی۔  
افشاں: اللہ — اللہ — بڑا خوش قسمت ہے عادل۔ مجھے تو رشک آنے لگا۔

(ماہ رخ حسین سی مسکراہٹ لبوں میں دبائے افشاں کو دیکھتی ہے)  
افشاں: (شوخی سے دیدے ٹٹکاتی ہے) کہیں — معاملہ گڑبڑ تو نہیں۔  
ماہ رخ: (رادائے دلربائی سے) بھو اس نہیں کرو۔

کینئر: (شرشرسی مسکراہٹ سے) زخمی نے بھی ہوش میں آتے ہی صاحبزادی صاحبہ کو لپکارا۔

ماہ رخ: (بکونہیں مصنوعی سا غصہ) بڑی باتونی ہو گئی ہے تو بھی۔

کینئر: خدائے بزرگ و برتری قسم کھاتی ہوں صاحبزادی صاحبہ۔ اس کے لبوں پر مبہم سی جو آواز تھی۔ وہ آپ کا ہی نام تھا۔ میں اس کے قریب ہی تھی۔

افشاں: (سر ہٹا لیتی ہے) اور ماہ رخ — تم کیا کیا سوچ رہی ہو۔

ماہ رخ: (افشاں کو جھنجھوڑ کر) کیا ہوگا افشاں — تم ہی بتاؤ نا۔

افشاں: کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آسمان گرے گا نہ زمین پھٹے گی۔ وہ اچھا بھلا ہو کر اپنے گھر سدھارے گا۔ اور تم اس عرصے میں اپنی جتنی توانائی ضائع کر چکی ہوگی۔ اس کا مداوا برسوں بھی نہیں ہو سکے گا۔

ماہ رخ: (سچا رنگی سے) تو — تو پھر میں کیا کروں — میں —

(کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہے۔ سامنے پردہ ہٹا کر کینئر اندر آ رہی ہے وہ چلنے سے زیادہ دوڑنے کا انداز اختیار کیے ہے۔ ماہ رخ اور افشاں دونوں بے اختیار مسند سے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں —)

ماہ رخ: (دبے تابی سے) کہو کیا خبر؟ (سانس تیزی سے چلتا ہے)

کینئر: زخمی ہوش میں آگیا صاحبزادی صاحبہ۔

ماہ رخ: شکر ہے تیرا یا خدا — بے اختیار نہ ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھ جاتے ہیں —)

افشاں: شکر ہے۔ (کینئر سے) کیا پوری طرح ہوش میں آگیا ہے۔

کینئر: جی ہاں۔ میں ابھی انہیں کے پاس تھی۔ گھنٹہ بھر سے میں وہاں تھی۔

ماہ رخ: ہوش کب آیا۔ خطرے سے نکل گیا نادہ — ٹھیک ہو جائے گا نا۔

کینئر: (شرشرسی مسکراہٹ) تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوش میں آئے ہیں۔

افشاں: (دبا دبا کے آنے کے بعد آیا ہوش —)

کینئر: آقا آپ کے پاس آئے تھے نا —؟

افشاں: ہاں

ماہ رخ: تم دوسری باتیں چھوڑو زخمی کے متعلق بتاؤ — اب اس کی حالت

راہ رخ کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے (جب تک پوری طرح ہوش نہیں آیا۔  
 آپ کا نام ہی لرزتا رہا اس کے لبوں پر۔  
 افشاں: (شکلیں مضحکہ خیز بناتی ہے) میں بھی حیران تھی۔ اللہ میری توبہ۔  
 ماہ رخ: (شرمگین مسکراہٹ سے) کینز یونیورسٹی تک رہی ہے۔ تم اس کی بات  
 پلے نہیں باندھ لو۔ چلو لیٹ جاؤ۔ آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ (اسے مسند  
 پر دھکیل دیتی ہے) افشاں اسے پھیرنے کو دیدے گھماتی اور شکلیں بناتی  
 ہے۔ ماہ رخ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔)

(عادل کی خواب گاہ۔۔۔ سبز اور سنہری رنگوں کا امتزاج دلکش  
 ہے۔ خوبصورتی سے آراستہ چیزیں فالوئس کی خواب آنگیں روشنی میں  
 چمک رہی ہیں۔۔۔ عادل ٹیکوں کے سہارے لیٹا ہے۔۔۔ آج چہرے  
 پر قدرے بے شاشت ہے۔ لیکن نڈھال اب بھی ہے۔۔۔ میر حیدر بڑی  
 محبت سے اس کی پٹی پر بیٹھے اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ مراد قریبی  
 نشست پر بیٹھا ہے۔ ماحول خوش گوار ہے۔)  
 میر حیدر: جب تک تمہارے زخم پوری طرح مندمل نہیں ہو جاتے۔۔۔ تم یہاں سے  
 کہیں نہیں جاسکتے عادل۔۔۔ میں تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ کہ اس  
 گھر کو اپنا گھر سمجھو۔۔۔

عادل: (احسان مندی سے) ذرہ نوازی ہے آپ کی۔

مراد: آپ نے جس خلوص اور محبت کا برتاؤ ہم پر دیسیوں سے کیا ہے ہمارا  
 رُواں رُواں احسان کے بوجھ سے دبا ہے۔۔۔ آپ۔۔۔  
 میر حیدر: (متانت سے) صاحب زادے تم بار بار احسان کا جتلا کر ہمارے  
 جذبات کو ٹھیس پہنچا رہے ہو۔۔۔

مراد: معافی کا خواست گار ہوں۔۔۔

میر حیدر (مسکرا کر) چلو اب تو معاف کیا۔۔۔ آئندہ یہاں سے چلے جانے کا

میر حیدر! میری ہی آرزو ہے — میں اس مغرور، سنگ دل اور جاہر مکران کو عرش کی بلندی سے فرش کی پستی میں گرا دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے بچے کے خون کا انتقام نہ لیا۔ تو میری روح بے چین رہے گی۔

عادل: ہم آپ کے بازو نہیں گئے بابا۔

میر حیدر: خدا کرے تم جلد اچھے ہو جاؤ — زخم میں تکلیف زیادہ تو نہیں۔  
عادل: (مسکرا کر) مجھے تکلیفیں بھیلنے کی عادت ہے بابا۔ — اور یہ تو کوئی ایسی تکلیف بھی نہیں۔ آپ نے جس محبت سے میری تیمارداری کی ہے۔ میرا باپ بھی ہوتا تو شاید نہ کرتا۔

میر حیدر: (اٹھتے ہوئے) اچھا تم اب آرام کرو — مراد تم بھی لیٹ جاؤ۔  
آج دن بھر تم گھومتے پھرتے رہے ہو — تھک گئے ہو گے۔

مراد: (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) آپ بڑے عظیم ہیں بابا۔ — ہمارا اتنا خیال رکھتے ہیں۔

میر حیدر: (پیارے اس کی کمر پتھکی دے کر) پھر وہی تکلفانہ انداز (مسکرا کر) لگتا ہے — اب آرام کرو برنور دار — صبح پھر ملیں گے۔  
شب بخیر۔

عادل اور مراد: شب بخیر۔

(میر حیدر متانت سے اپنے نئے قدم اٹھاتے کمرے سے نکل جاتا ہے۔)

اس کے جانے کا پوری طرح اطمینان کر کے مراد میر حیدر کی جگہ عادل کی پٹی پر آکر بیٹھ جاتا ہے — آنکھوں میں چمک ہے جسے کسی طور معصوم نہیں کہا جاسکتا — عادل خاموش ہے۔ سوچ میں ڈوبی آنکھیں ایک ہی سمت لگی ہیں —

مراد: (مسکرا کر عادل پر جھکتے ہوئے سرگوشی کرتا ہے) تقدیر ہم پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان معلوم ہوتی ہے۔

خیال بھی ابھی دل میں نہ لانا — میں تم دونوں کو بٹیا کہہ چکا ہوں۔

عادل: یہ آپ کی فراخ دل ہے بابا۔

میر حیدر: تو کیا ایسے ہی پسرا نہ جذبات مجھے لوٹانے میں تم بخل سے کام لینا چاہتے ہو۔

عادل: (بے چینی سے) نہیں بابا — شرمندہ نہ کریں — ہم شاید اس التفات کے حق دار نہیں تھے — ہم —

مراد: (جلدی سے عادل کی بات کاٹ کر) ہم آپ کے فرماں بردار ہیں بابا۔  
میر حیدر: (سکون آمیز لہجے میں) تمہاری سعادت مندی سے تو میں بہت سسی امیدیں وابستہ کر رہا ہوں بیٹے — میں نے اپنی داستانِ غم رات تھیں پوری تفصیل سے سنائی تھی — کیا تم میرے سینے کے چلتے الاؤ کو ٹھنڈا کرنے میں مدد نہ دو گے۔ قطب شاہ نے ظلم کی انتہا کر دی تھی بیٹے۔ وہ تو میری آنکھیں بھی نکلوا کر مجھے اندھا کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے ریاست کی اس جاگیر میں پناہ لی — گو معاملہ کچھ دب گیا ہے۔ لیکن میں اس بات سے باخبر ہوں کہ مجھے کاٹنا سمجھتا ہے۔ میں یہاں نظر بند ہوں۔ اور کسی وقت بھی —

مراد: جی ہاں — اس کی طرف سے کسی وقت بھی آپ پر عتاب نازل ہو سکتا ہے۔

عادل: (عالم غیظ میں) عتاب نازل ہونے سے پہلے ہی ہم اس پر قہر خداوندی بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس کو نیست و نابود کر دیں گے۔ اس کا سر قلم کر دیں گے۔

میر حیدر: زندگی تم پر اپنی مہربان مسکراہٹیں ہمیشہ نچاؤ کرتی رہے بیٹے۔

مراد: بابا — آپ بے فکر رہیں — ہمارے عزم سے چٹانیں ہل جائیں گی۔ یہ والی کیا وقعت رکھتا ہے —

عادل: (حیرانگی سے) کیوں؟  
 مراد: (اپنے گھیر دار لباس کی پٹی کھولتے ہوئے) کیوں؟ تمہیں احساس نہیں کیا؟ ہم اس وقت گوکنڈہ کے سابق وزیر اعلیٰ کے گھر میں ہیں عادل (سمجھانے کے انداز میں) میر حیدر کی پناہ میں — جو والی گوکنڈہ کا دشمن ہے — جاتی دشمن —

عادل: ہاں — بابا قطب شاہ کے دشمن ہیں۔  
 مراد: تو ہماری راہیں ہموار ہو گئیں نا — ہمیں بابا سے بہت کچھ مل سکتا ہے وہ ہم پر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد کر چکے ہیں۔  
 عادل: (دکھی انداز میں) جوان بیٹے کی المناک موت بہت بڑا حادثہ ہے کسی وقت تو انہیں حواس پر بھی قابو نہیں رہتا — وہ وہ باتیں کہہ دیتے ہیں جو شاید انہیں کبھی نہیں کہنا چاہئیں — بیچارے بابا —

مراد: اسی لیے تو کہا ہے تقدیر ہم پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہے۔  
 تمہارا تیر کھا کر زخمی ہونا بظاہر اک تکلیف دہ حادثہ ہے۔ لیکن میں اسے اپنی خوش قسمتی اور کامیابی کا پیش خیمہ کہوں گا — (پٹی اتار کر پلنگ پر ڈالتے ہوئے) قبائے بٹن کھولتا ہے، واقعی قسمت وقت کے ایوان میں وہ مطلق العنان ملکہ ہے جو چاہے تو ناکردہ گناہوں کو بھی سزا دے ڈالے اور چاہے تو کردہ گناہوں کا بھی بار اپنے کندھوں پر لے کر عفو کے سارے دروازے واکر کے انعام و اکرام سے بھی مالا مال کر دے (جھوم جھوم جاتا ہے) واہ تقدیر۔

عادل: (قد سے تکلیف سے سانس لیتے ہوئے) بہت مسرور نظر آرہے ہو۔  
 مراد: خوش بختیوں قدم چومنے لگے تو مسرور ہونے کا موقع نہیں کیا۔  
 عادل: اتنی خوش فہمی میں مبتلا ہونا حماقت بھی ہو سکتی ہے۔  
 مراد: نہیں عادل — میں ان چھ دنوں میں ہر چیز ہر واقعے اور ہر لمحے کا

مراد: (جلدی سے بات کاٹ کر) پاگل کہیں کے۔ تمہارا زخمی ہونا تو ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں —  
 عادل: شاید تمہاری سوچ کا انداز مثبت ہو۔

مراد: عادل — میں نے تمہیں کہا ہے ناکہ ہم اس وقت میر حیدر سابق وزیر اعلیٰ گوکنڈہ کی جاگیر میں اس کی رہائش گاہ میں مقیم ہیں۔  
 عادل: میں جانتا ہوں۔

مراد: میر حیدر قطب شاہ کی تباہی کے خواہاں ہیں۔  
 عادل: (بے دلی سے) ہاں۔  
 مراد: وہ ہم پر اعتماد بھی بہت کر رہے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم ان

بہ نظر غائر مطالعہ کرتا رہا ہوں — مجھے کامیابی یقینی نظر آرہی ہے۔  
 ہم وہ سارے راز حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کی مغل حکومت کو ضرورت ہے۔  
 عادل: (گہری سانس لے کر) ہوں۔

مراد: اور پھر ہمیں اپنی ہمت اور قوت پر بھی بھروسہ ہے۔ بیجا پور کی تسخیر میں تم جانتے ہو ہمارا کتنا حصہ ہے۔ شاہی سالار اعلیٰ نے یاد ہے ناکن الفاظ میں ہمیں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ شہزادہ معظم نے ہمیں انعام و اکرام سے مالا مال کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اور اب تو خود شہنشاہ عالی وقار نے ہمیں اس مہم کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

عادل: (ایک ہی سمت نظر میں جمائے سوچ میں ڈوبا ہے) کیوں؟  
 مراد: (اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) کیوں دوست کچھ چپ چپ ہو۔  
 کیا تمہیں اپنی کامیابی یقینی نظر نہیں آتی۔

عادل: میرا زخمی ہونا میرے کام کی راہ میں دیوار بنا ہوا ہے۔ خدا جانے میں کب —

مراد: (جلدی سے بات کاٹ کر) پاگل کہیں کے۔ تمہارا زخمی ہونا تو ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں —  
 عادل: شاید تمہاری سوچ کا انداز مثبت ہو۔

مراد: عادل — میں نے تمہیں کہا ہے ناکہ ہم اس وقت میر حیدر سابق وزیر اعلیٰ گوکنڈہ کی جاگیر میں اس کی رہائش گاہ میں مقیم ہیں۔  
 عادل: میں جانتا ہوں۔

مراد: میر حیدر قطب شاہ کی تباہی کے خواہاں ہیں۔  
 عادل: (بے دلی سے) ہاں۔  
 مراد: وہ ہم پر اعتماد بھی بہت کر رہے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم ان

مراد: دن رات بستر یہ لیٹے لیٹے تصورات کے تانے بانے ہی میں الجھ سکتے ہو۔  
تصورات تنہائی کی اذیت کو کم کر دیتے ہیں۔

عادل: میری اذیت تو دن بدن بڑھ رہی ہے۔

مراد: کن چکروں میں ہو۔۔۔ (اس کا کندھا ہلا کر) ہوش میں آؤ میاں۔  
یہ جذباتی باتیں چھوڑ دو۔

عادل: اگر میں یہ کہہ دوں کہ یہ میری زندگی ہیں تو۔۔۔

مراد: ارے تم تو بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے ہو۔ دل کا چکر تو نہیں چلا دیا۔

عادل: (مسکرا کر) دل نذرانہ بن کر کسی کے قدموں میں جانے کو تڑپ رہا ہے مراد۔

مراد: (راچھل پڑتا ہے) اس کے قدموں میں ہیں۔ کہیں اس کینئر پر تو لٹو  
نہیں ہو گئے۔ جو دن رات تمہاری خدمت پر مامور ہے۔

عادل: (مسکراتے ہوئے) میرا ذوق نظر اتنا پست نہیں۔

مراد: تو پھر اور کون ہے؟

عادل: ماہ رخ۔

مراد: (رشتہ بھوکرا) تم نے اسے کہاں دیکھا۔

عادل: یہ ہوش ہونے سے قبل چند لمحوں کے لیے۔۔۔ صرف چند لمحوں کے

لیے اسے دیکھا۔ لیکن یہ لمحے میری ہستی کے گرد خوشبو کی طرح پھیل گئے

ہیں مراد۔۔۔ لمحے کا یہ وار تیر کے وار سے بھی زیادہ شدید تھا۔ وہ۔ وہ۔

مراد: (اس کی ٹھوڑی ہلا کر) نظر انتخاب لا جواب ہے۔ لیکن میاں مجنوں تم

یہاں عشق فرماتے نہیں آئے کام کرنے آئے ہو۔ اپنے ملک اپنی

حکومت اور اپنی فوج کے لیے کام۔

عادل: میں نے اپنے کام سے انکار کیا ہے نہ اس کی اہمیت کو بھولا ہوں۔

مراد: تو پھر مابودت کی طرف سے اجازت ہے۔ جب تک بستر پر پڑے ہو۔

ایک طرف عشق ڈٹ کر کیئے جاؤ۔

کی ہمسایہ ریاست بجا پور کے رہنے والے ہیں۔ اور اس دوست ریاست میں  
بغرض سیاحت آئے ہیں۔

عادل: تم نے بابا کو یہی بتایا ہے۔

مراد: ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ کہ ہم مغل حکومت کے بھیجے ہوئے

جاسوس ہیں اور یہاں اس غرض سے آئے ہیں کہ گوگنڈہ کے اندرونی حالات

کا جائزہ لیں۔ خفیہ معلومات حاصل کریں۔ فوجی اہمیت کے راز پائیں۔

(جب تک کر سرگوشی کے انداز میں) کیوں؟

عادل: ہوں۔

مراد: ہر قدم پر بابا ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ گوگنڈہ کے متعلق انہیں

کیا معلوم نہیں۔ صرف تین ماہ پہلے وہ اس ریاست کے سیاہ و سفید کے

مالک تھے۔ کل بابا بتا رہے تھے ناکہ تانا شاہ کو تو صدمہ کی بیس ہزار

رقاصاؤں اور ارام النجاشٹ کے پیانوں ہی سے فرصت نہیں۔ وہ کبھی

اپنے صدر مقام حیدر آباد سے باہر نہیں آیا۔

عادل: ہوں۔

مراد: یہ گم صم ہوں ہاں کیا کیے جا رہے ہو۔ اپنے یہاں وارد ہونے کے

مقصد کو بھول تو نہیں گئے۔

عادل: (قدرے مسکراتے ہوئے) نہیں عادل اپنے مقصد کو تو نہیں بھولا۔ البتہ

مراد: (تشویش سے) البتہ کیا؟

عادل: (مسکرا کر) البتہ اپنے آپ کو بھولتا جا رہا ہوں۔

مراد: اوہ۔۔۔ بڑے رومانی ہو رہے ہو۔

عادل: سینے پہ تیر کا گھاٹ ہے مراد۔

مراد: (شوخی سے) جو خاصہ خطرناک ہے۔

عادل: بالکل!



عادل: (شگفتہ مسکراہٹ سے) ایسا تو نہ کہو مراد — تم میرے دوست ہو — جگر می دوست — تمہیں تو یوں کہنا چاہیے کہ عادل اگر تم اندھیروں سے سفر جاری کرنے کے بعد کہیں بھٹک گئے — راستوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تو میں روشنی کو پہنچ کر تمہاری راہوں میں لے آؤں گا —

مراد: اوہو — رہنس دیتا ہے —، اچھا اب سو جاؤ اور خوابوں کے الجھاؤ میں کھو جاؤ — مجھے تو امید نہیں کہ تم کبھی اپنی محبوبہ کی ایک جھلک بھی دیکھ سکو گے۔ خواب تمہارے اپنے ہیں۔ خوب لطف اندوز ہوا کرو۔ راتھ کر اپنے بستر کی طرف جاتا ہے — عادل خواب ناک نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ مراد بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا ہے اور سو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ریشمی چادر سیلنے تک کھینچ لیتا ہے۔

عادل: ایک طرف کی مجھے پرواہ نہیں مراد — تم کیا جاتو — محبت تو اک جگمگاتی روشنی ہے اور ہمارے وجود کائنات میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں نے روشنی کو پانے کا اندھیروں سے سفر شروع کر دیا ہے۔ کون جانے روشنی تک پہنچ پاؤں گا بھی یا نہیں۔ لیکن میں اپنے سفر سے مطمئن ہوں کہ جگمگاتی روشنی میرے دل کے گوشے گوشے میں عکس انداز ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کوئی اور بھی — (مسکرا دیتا ہے) کوئی اور بھی اس روشنی کے حصول کے لیے اندھیروں سے سفر کی ابتدا کر چکا ہو —

مراد: (لقمہ دیتے ہوئے) اور اندھیروں کے راہی کہیں راستے ہی میں ایک دوسرے سے مل جائیں — ایک ہی جگمگاہٹ کی تلاش جو دونوں کو ہوگی۔ ظاہر ہے کہ راستے کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔

عادل: تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

مراد: (راکتے ہوئے) اچھی صاحب زاوے محبت کرنا تمہارا ذاتی معاملہ ہے میں کچھ کہہ نہیں سکتا — لیکن جس مقصد کے لیے ہم آئے ہیں۔ اس میں تمہاری محبت خارج ہوئی۔ تو یاد رکھنا۔ میں برداشت نہیں کروں گا۔ مجھے فرض شہنشاہ عالمگیر اور نگ زیب نے سونپا ہے۔ اور میں اس عتاب کو نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ جو فرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں شہنشاہ کی طرف سے ہم پر نازل ہو سکتا ہے۔

عادل: تمہیں یہ وہم کیوں ہونے لگا — کہ میں —

مراد: عشق انسان کو نکما اور نا اہل بنا دیتا ہے۔

عادل: یہ تمہاری بھول ہے — عشق نور ہے۔ عشق روشنی ہے۔ عشق —

مراد: بس۔ بس — میں کچھ نہیں سمجھنے کا — یہ باتیں اپنے دل سے ہی کرتے رہو — تمہیں بتا دو کہ اس سلسلے میں میں تمہاری کوئی مدد بھی نہ کر سگوں گا —



والے سورج کی روشنی کو اندھیروں میں سمٹتے دیکھ رہی تھی۔ اندھیروں کی لابی لابی زبانیں روشنی کو چاٹ گئیں۔

افشاں: (مسکرا کر) تو اس میں افسردہ ہونے کی کیا بات ہے بالو۔ صبح طلوع ہوگی۔۔۔ تو رماہ رخ کا انداز اختیار کرتے ہوئے، تو روشنی کی لابی لابی زبانیں اندھیروں کو چاٹ جائیں گی۔ اولے کا بدلہ۔ ماہ رخ: روشنی اور اندھیروں کی جنگ ازل سے ہی جاری ہے۔ کون جانے فتح کس کی ہوگی۔

افشاں: اتنے دقیق فلسفوں میں گم ہونے کی ضرورت نہیں۔ روشنی روشنی ہے اور اندھیرے اندھیرے۔ کوئی فاتح ہے نہ مغلوب۔ زندگی کے ایوانوں سے ان کے گزرنے کے وقت معین ہیں۔۔۔ اور بس۔

ماہ رخ: کتنی اچھی ہو تم افشاں۔۔۔ کہ تمہیں اندھیروں کا احساس ہے نا روشنی کی اہمیت جانتی ہو۔

افشاں: آج تم کیا ڈوب ڈوبی گری گری باتیں کر رہی ہو ماہ رخ۔۔۔ شام ہوگئی تمہیں آج شجاع بھائی کی قبر پر چراغ روشن کرنا بھی بھول گیا۔

ماہ رخ: کیا تم سمجھتی ہو کہ میں یہ بات بھول سکتی ہوں؟ افشاں: تو چلو پھر۔

ماہ رخ: میں چراغ روشن کر کے ہی ادھر آئی تھی۔

افشاں: رحیرانگی سے، واقعی؟

ماہ رخ: رافسردگی سے، ہاں افشاں۔

افشاں: اکیلے گئی تمہیں۔۔۔ یا کوئی کینز۔

ماہ رخ: کسی کو ساتھ لے جانے کی ضرورت میں محسوس نہیں کرتی۔

افشاں: آج تم نے میرا بھی انتظار نہ کیا۔

ماہ رخ: تم ابھی بھی جاسکتی ہو۔۔۔ میں تو وہاں اپنا فریضہ ادا کرنے جاتی

دشام کی سانولی دلہن کا اسچل لہرا رہا ہے۔۔۔ پندے اپنے بسیروں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ درختوں اور پودوں میں ہوا تھم تھم کر سرک رہی ہے۔۔۔ ماہ رخ ایک پرانے درخت کے تنے سے ٹیک لگاٹے کھڑی ہے۔ اس نے ہلکے رنگ کا لباس پہن رکھا ہے۔ دوپٹے کے کناروں پر ٹنگی سنہری گوٹ اس کے خوبصورت چہرے کا ہالہ تکیے ہے گھیر واریشواز اور حیدر آباد پا جاے نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کاتوں کے جڑاؤ آویزے گالوں کو چھو رہے ہیں وہ کچھ اداس کچھ پریشان نظر آ رہی ہے۔۔۔ تنے سے ٹیک لگاٹے خیالوں میں گم ہے۔۔۔ پیچھے سے افشاں تقریباً ویسے ہی لباس میں آتی ہے۔۔۔ چند لمحے کھڑی رہتی ہے۔ لیکن ماہ رخ کو اس کی آمد کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھتی ہے۔ اور زور سے ماہ رخ کے کندھے پر ہاتھ مارتی ہے۔۔۔ ماہ رخ گھبرا کر پلٹی ہے۔

: افشاں۔۔۔ تم۔۔۔ ڈرا ہی دیا مجھے۔

افشاں: اس کے سامنے آکر کیا بات ہے۔ اکیلے یہاں کیا کر رہی ہو۔

ماہ رخ: قدرے اداس آواز میں، کچھ نہیں۔۔۔ یونہی کھڑی ڈوب جانے

میں یہ بھی نہیں جانتی — مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ گرد و پیش سے کبھی خوف آنے لگتا ہے۔ تو کبھی اس میں مدغم ہو جانے کو جی مچلتا ہے — شب دروز کی تفریق بھی مٹتی جا رہی ہے — میں کل آدھی رات سے طلوع آفتاب تک چین میں ٹہلتی رہی ہوں۔

افشاں: ذہنی طور پر سخت پریشان معلوم ہوتی ہو۔

ماہ رخ: ہاں۔

افشاں: لیکن یہ پریشانی کیوں — ماہ رخ کا چہرہ دیکھتی ہے — پھر قریب اگر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تمام کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔ ایک بات پوچھوں۔

ماہ رخ: اثبات میں سر ہلا کر ہوں۔

افشاں: سچ بتا دو گی۔

ماہ رخ: رینزاری سے، تمہید کو اتنی طوالت نہ دو۔ میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

افشاں: کیا تمہیں! — تمہیں عادل کا خیال!

ماہ رخ: (چہرہ چھڑا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے) میں کیا کروں افشاں! افشاں: اللہ — میں اب سمجھی۔

ماہ رخ: (افشاں کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہے اور بے بس آواز میں کہتی ہے) میں اس کے خیال سے جتنا چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اتنا ہی میرے حواس پر مسلط ہوتا جا رہا ہے افشاں —

افشاں: (اسے ساتھ لپٹا کر) تو یہ بات تھی —

ماہ رخ: ہاں — مجھے اقرار ہے — لیکن تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔

افشاں: اتنے زور شور سے گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اسے تھپکاتے ہوئے عادل تمہارے خیالوں میں آ ہی بسا تو اس میں تردد کی کیا بات ہے۔

ہوں — تم فاتح کہنے کسی وقت بھی جاسکتی ہو —

افشاں: کہہ تو ٹھیک رہی ہو — لیکن مجھے بھی ساتھ لے جانے میں تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔

ماہ رخ: چلو کوئی اتنی بڑی بات نہیں —

افشاں: بات بڑی کیوں نہیں — (خفگی سے) میں دیکھ رہی ہوں چند دنوں سے تم الگ تھلک رہنے کی کوشش کرتی ہو — گم صم — چپ چاپ۔

ماہ رخ: (سکرانے کی کوشش کرتی ہے) تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

افشاں: رمنہ پھلا کر گویا تم مانتی ہو کہ تم الگ تھلک رہنے کی کوشش کرتی ہو۔

ماہ رخ: میرا جواب اثبات میں ہوتا —

افشاں: تو میں روٹھوں گی نہیں — بلکہ حکماً وجہ پوچھوں گی — اس کا گال تھپک کر سمجھیں — میرا نام افشاں ہے — تمہیں اس کی وجہ بتانا پڑے گی —

ماہ رخ: (ایک دم سنبیدہ ہو جاتی ہے) وجہ تو میں خود بھی نہیں جانتی۔ تمہیں کیا بتاؤں گی۔ بس یہی جی چاہتا ہے — جی چاہتا ہے —؟

افشاں: (دل چسپی سے) کیا جی چاہتا ہے؟

ماہ رخ: پتہ نہیں (انس دیتی ہے)

افشاں: پاگل تو نہیں ہو گئیں۔ (غور سے) ماہ رخ کو دیکھتی ہے۔ ماہ رخ پھر سنبیدہ نظر آنے لگتی ہے۔)

ماہ رخ: کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے پاگل ہو جاؤں گی — مجھے خدا جانے کیا ہوتا جا رہا ہے افشاں — میرا دل سخت گھبراتا ہے — الجھنیں —

پریشانیاں —

افشاں: (قدرے گھبرا کر) تم ٹھیک تو ہو۔

ماہ رخ: (چند قدم اٹھا کر دوسرے درخت کی جھولتی شاخ کو تھام لیتی ہے)

ماہ رخ: راگ ہو کر رخ دوسری طرف پھیر لیتی ہے، مجھے ڈر لگتا ہے۔  
افشاں: کس بات کا۔

ماہ رخ: لہروں کے گیت مونگے اور سیپ کے سینوں میں بند ہوتے ہیں افشاں۔  
انہیں کوئی نہیں سن سکتا۔ لیکن جب کان لگا کر کوشش کی جائے تو  
سینوں میں مقید لہروں کے گیت کانوں میں اترنے لگتے ہیں۔ عادل  
کی محبت لہروں کے گیت کی طرح میرے دل میں مقید ہے۔ ڈرتی ہوں  
کان لگا کر لوگ سننے لگے تو کیا ہوگا۔

افشاں: تم بے حد جذباتی لڑکی ہو ماہ رخ۔ میرا تمہارا ہمیشہ نظریاتی اختلاف  
رہا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ کوئی تمہارے دل کے رازوں سے آشنا ہونے  
کی جرات نہیں کر سکتا۔

ماہ رخ: (بے اعتباری سے) تم جان گئی ہوتا۔ اسی طرح ایک دو تین اور پھر  
بہت سے لوگوں کو پتہ چل گیا۔ تو۔۔۔

افشاں: (مذاق سے) یہ مجھ پر پھوڑ دو۔ ایک دو تین اور پھر بہت سے لوگوں  
کو پتہ اسی وقت چلے گا۔ جب تم عادل کی دلہن بن کر ہمیں۔۔۔

ماہ رخ: (شرم سے سرخ ہو جاتی ہے) تم بہت بے باک ہو۔

افشاں: شرمانے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تو تمہارے دل کی بات کہہ دی نا۔

ماہ رخ: (بیچ کر) افشاں۔

افشاں: (اسی انداز میں) ماہ رخ۔

(دونوں مسکرانے لگتی ہیں) اور پھر بے اختیارانہ ایک دوسرے

سے لپٹ جاتی ہیں۔)

رچاندنی فضا میں نورانی غبار بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ رنگارنگ پھولوں  
کی خوشبو اس غبار سے لپٹی ہوئی ہے۔ دیو قامت درخت ایستادہ ہیں۔ اور  
خوبصورت لکھیلی بلیں ان کے تومند تنوں سے والہانہ لپٹی ہیں۔ مرمریں  
بارہ درہ پر چاند کی کرنیں پھیلی رہی ہیں۔ پرندے سوچکے ہیں۔ بامیرے پرستون  
ہیں۔ ہوا بھی تھم تھم کر چل رہی ہے۔ بارہ درہ کی مرمریں بیڑھیوں  
پر عادل بیٹھا ہے۔ اس کے زانو پر بربطا پڑا ہے۔ اس کی انگلیاں حسین  
اور رسیلے نغموں کو جنم دے رہی ہیں۔ چاندنی اور خوشبوؤں کا غبار سروں  
سے مرتعش ہے۔ عادل کی خوابیدہ آنکھوں میں جاگتے خواب ہیں۔  
اس کے سینے پر ابھی تک پٹی بندھی ہے۔ زخم بھر رہا ہے۔ لیکن زخم  
کی افیت جین نہیں لینے دیتی۔ وہ اس وقت یہ خودی کے عالم  
میں بربطا کے تاروں سے دل کی آواز فضا میں بکھیر رہا ہے۔ کینز  
چند قدموں کے فاصلے پر اس کی محویت ٹوٹنے کی منتظر ہے۔ سحر پھیلتا  
جا رہا ہے۔ کینز بھی نغموں کی لے میں ڈوب جاتی ہے۔ اور پھر آہستہ  
آہستہ نغمہ ڈوبنے لگتا ہے۔ انگلیاں سست پڑنے لگتی ہیں۔ کینز  
قدم اٹھا کر آگے بڑھتی ہے۔ نغمہ ڈوب جاتا ہے۔ عادل اپنی انگلیوں  
کو مروڑتے ہوئے سوچوں میں گم ہو جاتا ہے۔)

کینئر: (شوخی لگا ہی سے) جی۔

عادل: یہ تم نے کیا کہا — اور — اور کون — میرے لیے پریشان ہو سکتا ہے — یہ خوش فہمی —

کینئر: سائولی بچہ نہیں صاحب — پریشانیوں کو آنکھوں میں پڑھ لیتی ہے (خفزد) میں بہت کچھ جانتی ہوں — (مسکراتے لگتی ہے)

عادل: (اسے چند لمحے دیکھتا رہتا ہے) — پھر بٹاشٹ سے کیا جانتی ہو۔ کیا مجھے نہ بتاؤ گی۔

کینئر: یہی کہ کوئی آپ کے لیے سراپا پریشانی بنا رہتا ہے۔

عادل: (دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے) کون ہے وہ —!

کینئر: (شوخی سے) مجھ سے نہیں اپنے دل سے پوچھئے صاحب —

عادل: (راٹھ کر قدم اٹھانے لگتا ہے) دل نے امیدوں کے سہارے کوئی ایسا نام چن لیا — جسے پریشانی تو کیا احساس بھی نہ ہوا — تو —

کینئر: (مسکراتے) صادق جذبے غلط نقطوں کے گرد نہیں گھومتے — میں

مہینہ بھر سے آپ کے خیالات و جذبات کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اگر

میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ آپ عشق کے منازل انتہائی سرعت سے

طے کر چکے ہیں۔ تو بے جا نہ ہوگا — کچھ ایسی ہی کیفیت دوسری جانب

بھی ہے۔

عادل: (اس کے سامنے آکر) تو کیا میں بے دھڑک ماہ رخ کا نام لے سکتا ہوں۔

کینئر: (مسکراتے ہوئے) میں نے کہا نا صادق جذبے غلط نقطوں کے گرد

نہیں گھومتے —

عادل: تو کیا — تو کیا؟ — سائولی — میں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں۔

کہیں — تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اتنے دنوں —

کینئر: میں آپ کے جذبات کی گہرائیوں کا مطالعہ کر رہی تھی —

کینئر: (قدم بڑھا کر اس کے قریب آتی ہے) صاحب عالی۔

عادل: (آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے) کیوں؟

کینئر: رات بھیگ چکی ہے۔ چل کر آرام فرمائیے۔

عادل: تم جاؤ — میں جب طبیعت چاہے گی جا کر سو جاؤں گا۔

کینئر: اتفاقاً حکم ہے کہ آپ کے سو جانے کے بعد میں —

عادل: بابا نا حق میرے لیے اتنے تکلفات کرتے ہیں۔

کینئر: میں ان کے حکم کی پابند ہوں۔ آپ کو ابھی دوائی بھی کھانا ہے۔ اور

دودھ بھی پینا ہے۔

عادل: یہ بھی بابا کا حکم ہے۔

کینئر: جی ہاں۔

عادل: (رگہری سانس لے کر ربط ایک طرف رکھ دیتا ہے) مجھے اس وقت نیند

آ رہی ہے۔ نہ کھانے پینے کی طلب ہے۔ میں کچھ دیر اور اس طلسماتی فضا

میں سانس لینا چاہتا ہوں۔

کینئر: آپ ابھی کمزور ہیں۔ ہوا میں خشکی بڑھ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو زخم کی تکلیف

بڑھ جائے۔ آقا اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دیں گے۔

عادل: بابا کتنے اچھے، کتنے ہمدرد اور کتنے مخلص ہیں۔

کینئر: وہ آپ کو ہمان نہیں۔ اس گھر کا فرد سمجھتے ہیں۔ اس لیے تو آپ کے لیے

انتہا پریشان رہتے ہیں۔

عادل: یہ ان کی نوازش ہے (سر جھکا کر آہستگی سے) اس گھر میں ایک بابا یا پھر

تم — (مسکراتے لگتا ہے) جو میرے لیے پریشان رہتے ہو۔

کینئر: (راٹھلا کر) صرف میں اور آقا؟ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں (ادا کے ساتھ)

ہو سکتا ہے۔ آپ کے لیے کوئی اور ہم سے بھی زیادہ پریشان ہو۔

عادل: (حیرت سے کینئر کو دیکھتا ہے) سائولی۔

عادل: لیکن میرے لیے معاملہ برعکس ہے۔ میں ٹھیک ہو گیا۔ تو پھر۔۔۔ یہاں سے چلے جانا یقینی ہے۔ کیا اپنے مرکز سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانے سے پہلے میں ماہ رخ سے مل سکتا ہوں۔ ایک بار۔ صرف ایک بار سانولی۔ جہاں اتنا احسان کیا ہے وہاں۔۔۔

کینئر: (سونچ میں پڑ جاتی ہے) یہ تو۔۔۔

عادل: دیکھو سانولی۔ میری تمنّا حق بجانب نہ سہی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ تمنّا تو ہے۔۔۔

کینئر: (قدرے رک کر) میں آپ کے جذبات سے آگاہ ہوں۔۔۔ تمنّا کی شدت کا اندازہ بھی کر سکتی ہوں۔ لیکن۔۔۔ یہ اتنا بڑا کام۔۔۔ عادل: خدا کے لیے سانولی مجھے یالوس نہ کرو۔

کینئر: (سوچتے ہوئے) آپ یہ قدم خود ہی کیوں نہیں اٹھاتے۔

عادل: میں؟ کیسے؟ کیوں کر۔۔۔

کینئر: (آہستگی سے) ہر شام جب سورج ڈوب جاتا ہے۔ صاحبزادی صاحبہ اپنے بھائی کی قبر پر دیے جلانے جاتی ہیں۔ وہ سامنے۔۔۔ وہ درختوں کے جھنڈ کے پار۔۔۔ بارہ دری کے عقب میں جو عمارت نظر آ رہی ہے نا۔ وہی قبر ہے۔ ہر شام وہاں جاتی ہیں۔۔۔ عادل: تو پھر؟

کینئر: آپ بڑے سادہ لوح ہیں (ہنستی ہے) میں نے صاحبزادی صاحبہ کے معمول سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ راستہ بھی بتا دیا ہے۔۔۔ راستے کہیں بھی آپس میں مل سکتے ہیں۔

عادل: (مسرور ہو کر) ادھ سانولی۔۔۔ تم کتنی ذہین ہو۔

کینئر: شکریہ۔۔۔ اچھا تو آپ اب باتیں پھوڑیے۔ اندر تشریف لے چلیے۔۔۔ عادل: نہیں۔۔۔

عادل: میں نے ماہ رخ کو چند لمحوں کے لیے دیکھا ہے سانولی۔ لیکن چند لمحوں کی ہلچل میری پوری زندگی پر چھا چکی ہے۔ میں اپنے دل کی آواز کو کیوں کر ماہ رخ تک پہنچاؤں۔

کینئر: آواز میں صدق ہو تو خود بخود فاصلوں کا سفر طے کر لیتی ہے۔ آپ کے بربط کی لئے ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر صاحبزادی صاحبہ تک پہنچ رہی ہے۔ بے فکر رہیے۔ جب تک بربط سے نغے پھوٹتے رہتے ہیں وہ محویت کے عالم میں ستون کے سہارے کھڑی ان نغوں کا درد اپنے دل میں بسا قی رہتی ہیں۔

عادل: کہیں تم مجھے بنا تو نہیں رہیں۔

کینئر: ایسی جرأت کی مرتکب ہونے کی مجھے حیرات نہیں۔ آج آپ بربط بجاتے ہوئے اتنے بے چین تھے کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ شاید میں نے وہ بات کہہ دی ہے جو مجھے نہ کہنا چاہیے تھی۔

عادل: میں تمہارا احسان مند ہوں سانولی۔ (اظہار تشکر سے آواز کا نپ جاتی ہے۔) تم نے مجھے روشنی کی کرن دکھا کر راستوں پر بھٹکنے سے بچالیا۔

کینئر: میں محبت کی عظمت سے آگاہ ہوں صاحب عال۔ میں آپ کو نہ بھی بتاؤں۔ تو بھی آپ کے صادق جذبے آپ کی رہنمائی کر دیتے۔

عادل: تم کتنی ذی فہم ہو۔

کینئر: شکریہ۔

عادل: سانولی۔

کینئر: جی۔

عادل: میں اب صحت یاب ہو رہا ہوں۔

کینئر: خوشی کی بات ہے۔

کینئر: کیوں؟

عادل: آج رات بھر میں اس فسوں خیز فضا میں بربط کے تاروں کے واسطے سے

اپنا حال دل کہتا رہوں گا۔ سانولی آج میں رات بھر بربط بجاؤں گا۔

میری انگلیاں شل ہو جائیں۔ تو بھی بجاتا رہوں گا۔

کینئر: (مسکرا کر) کیوں صاحب زادی صاحبہ کو رات بھر جگائے رکھنا چاہتے ہیں۔

عادل: (جھوم کر) جاگیں تمام رات جاگیں تمام رات ربط تمام لیتا ہے،

کینئر: تو واقعی نہیں جائیں گے آپ۔

عادل: تم جاسکتی ہو۔

کینئر: لیکن آقا —

عادل: بابا سے کہہ دینا کہ تمہیں میں نے سبک دوش کیا ہے۔

کینئر: (مسکراتی ہے) خدا حافظ —

عادل: خدا حافظ۔

رکینئر چل جاتی ہے۔ عادل بربط کے تاروں کو چھیڑنے لگتا ہے۔

نغمے فضا میں بکھرنے لگتے ہیں — چاندنی اور خوشبوؤں کا غبار اور

گہرا ہو جاتا ہے،

رات کسی نئی نویلی دلہن کی مانگ کے سندور کی طرح چمک رہی  
ہے ستاروں کی آنکھوں میں خواب لہرا رہے ہیں۔ فضا میں نور کی بارش  
ہے۔ چمن آسودگی کی آغوش میں مچل رہا ہے۔ پھول، پودے، بیلین  
اٹھڑپنے سے لہرا رہے ہیں۔ ایک پرانے درخت سے ٹیک لگائے ماہ رخ  
حسن مجسم بنی کھڑی ہے۔ چاندنی اور اندھیروں کی آنکھ مچولی حسین ہے۔  
قریب ہی درخت کی بوڑھی لٹ تھامے عادل برق پاش نظروں سے  
اسے دیکھ رہا ہے —

عادل: (غور آواز میں) ماہ رخ۔

ماہ رخ: رشرگین اداسے اجی۔

عادل: سوچتا ہوں۔ کہیں خوشیوں کے اس والہانہ التفات سے میں پاگل نہ ہو جاؤں۔

ماہ رخ: راک نگاہ دنوازا اس پر ڈالتے ہوئے، انسان غموں اور خوشیوں کی انتہا

سہہ جانے کا عادی ہے۔ خاطر جمع رکھیے پاگل نہیں ہونگے آپ۔

عادل: (ریار سے) مجھ سے تو خوشی کی انتہا برداشت نہیں ہو سکتی۔ غم سہہ جانے

کے تو خیال ہی سے روح لرز اٹھتی۔

ماہ رخ: (مسکراتے ہوئے) غم کا قصور روح فرسا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ ٹوٹ

پڑتا ہے تو انسان انتہائی سمنٹ جانی سے اسے جھیل جاتا ہے (اداس ہو کر)

رہنا ہے سمجھے۔ یہیں رہنا ہے۔

عادل: (جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) ماہ رخ تم مجھے نئی زندگی عطا کر رہی ہو۔ میں اب کوئی دوسرہ، کوئی خدشہ اپنے پاس پھٹکنے نہیں دوں گا۔ مجھے کوئی ڈر نہیں۔

ماہ رخ: (رادائے دلربائی سے) کیا آپ اتنے بزدل ہیں کہ ڈرنے کی نوبت آگئی۔ عادل: میں۔۔۔ میں بزدل نہیں ہوں ماہ رخ۔ میں کتنا بہادر، کتنا نڈر اور کتنا جبری انسان ہوں۔ وقت تمہیں بتائے گا۔

ماہ رخ: (رادائے دلبری سے) وقت نے تو ابھی یہی بتایا ہے کہ عورتوں کے تیروں سے زخمی ہو جاتے ہیں۔

عادل: اسے اگر تم میری بزدلی سے تعبیر کرتی ہو۔ تو اس بزدلی پر میں نازاں ہوں۔

ماہ رخ: اودہ ہو۔ اصول ایک ہونا چاہیے۔ اس کی تفسیر موقع محل سے بدل نہ جانی چاہیے۔

عادل: میری زندگی بدل چکی ہے۔ میں اصول کے بدلنے کو کیا دیکھوں۔ ماہ رخ یہ حسین حادثہ نہ پیش آتا۔ تو میری زندگی کتنی نامکمل۔ کتنی ویران اور کتنی ناآسودہ ہوتی۔ اس تیر نے میری زندگی کا جہود توڑ دیا ہے۔ مجھے زندگی کے دلولوں، انگلوں اور چاہتوں کا حسن دیا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے آگہی بخشی ہے۔

ماہ رخ: (مسکراتی ہے) بس بس۔ اتنی شاعری نہ فرمائیے۔ آئیے اس ندی تک چلیں۔ نور کی چادر سی بہتی لگ رہی ہے چاندنی میں۔

عادل: (عذبات سے بھرپور آواز میں) نور درنگ کا سیلاب تو سمٹ کر میرے پہلو میں آگیا ہے۔ میری نگاہوں میں کوئی جلوہ کوئی منظر۔ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

میری طرف دیکھئے۔ بابا کو دیکھئے ہم بھی تو شجاع کی جدائی کا غم جھیل گئے ہیں۔ (آہ بھر کر) میں نے تو شجاع کے یوں پھڑ جانے کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں کیا تھا۔ (درد سے مسکراتے ہوئے) لیکن دیکھ لیں۔ اس کے پھڑ جانے پر بھی زندہ ہوں۔

عادل: پھڑنا کتنا اذیت دہ ہے ماہ رخ۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ احساس جاگتا ہے۔ تو مجھے اپنا دماغ مفلوج ہوتا محسوس ہوتا ہے ماہ رخ تم نے مجھ پر جو جادو کر دیا ہے۔ تم سے پھڑ کریں تو زندہ رہنے کا سوتج ہی نہیں سکتا۔

ماہ رخ: کوئی اور بات کیجئے عادل۔ یہ تکلیف دہ۔ عادل: اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) ماہ رخ۔ کہیں ہم دونوں پھڑ تو نہ جائیں گے۔

ماہ رخ: (گھبرا کر) آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں عادل۔ عادل: اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر دونوں ہاتھ ملتے ہوئے) بعض اوقات یہ حقیقت انکار سے کی طرح ذہن سے چپک جاتی ہے۔ کہیں اب صحت یاب ہو گیا ہوں۔ اور مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔

ماہ رخ: (بے چین ہو کر) یوں نہ کہیے۔ آپ یہاں سے نہیں جاسکتے۔ (اس کا بازو تھام لیتی ہے) بابا آپ کو کبھی جانے نہ دیں گے۔ ابھی تو آپ نے بابا سے کیا ہوا وعدہ بنا ہنا ہے۔ بابا تو اسی آس پر جی رہے ہیں۔ کہ آپ ان کے بیٹے کے لہو کا انتقام لیں گے۔ ان کی سلگتی خواہش کو پورا کریں گے۔ کیا آپ اپنا وعدہ بھول گئے۔

عادل: (پر عزم لہجے میں) میں اپنا وعدہ نہیں بھول سکتا ماہ رخ۔ ماہ رخ: (خوشی سے) تو پھر اس بے جادو سے کو کیوں ذہن نشین کیے ہوئے ہیں۔ اس آوارہ سوتج کو ذہن سے جھٹک دیکھئے۔ آپ کو یہیں



عادل: شاید مجھ سا خوش نصیب انسان دنیا میں کوئی ہوگا۔ ماہ رخ کو بازو میں تھام کر۔۔۔ تم میرے لیے کیا ہو ماہ رخ۔۔۔ زندگی بھر بھی کہتا رہوں۔۔۔ تو شاید اپنا مطلب بیان نہ کر سکوں۔۔۔ یہ نہ بتلا سکوں کہ تم میرے لیے کیا ہو۔۔۔

ماہ رخ: (قدم اٹھا کر) آئیے۔۔۔ کوئی اور باتیں کریں۔ (داداٹے دلفریبی سے مسکرا کر) آپ تو شاعری پڑھتے آئے۔ کوئی اور باتیں کریں۔

عادل: (راس کے ساتھ چلتے ہوئے) نہیں۔۔۔ میں تمہاری قربت کے ان حسین لمحوں کو ایسی ویسی باتوں کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔

ماہ رخ: (سرشار لہجے میں) تو پھر کن باتوں کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔

عادل: (بدست لہجے میں) صرف دلوں کی دھڑکنیں سننے اور ستانے میں یہ وقت صرف کرنا چاہتا ہوں۔ آؤ۔ ندی کنارے میں بربط بجاؤں گا۔

تم اپنی آواز کا جادو جگانا۔۔۔

ماہ رخ: آپ بربط بجا ئے گا۔ اور میں بہتی ندی میں لرزتے ستاروں کا عکس دیکھوں گی۔ بربط سے پھوٹے نعروں کی زبان خاموشی سے سمجھنے کی کوشش کروں گی۔

عادل: بڑی ذہین ہو۔

ماہ رخ: کیوں؟

عادل: کس خوبصورتی سے گانے سے انکار کر دیا۔ تمہاری ذہانت قابلِ داد ہے۔

ماہ رخ: (مسکرا کر) آپ بھی ضرورت سے زیادہ ہی سمجھدار ہیں۔ ذہانت کو سمجھنے کے لیے بھی ذہانت کی ضرورت ہے۔

عادل: آؤ چلیں۔۔۔ موسم آج دلفریبی اور نشے سے چور چور ہے۔

ماہ رخ: (رشتا سنگی سے اپنا ہاتھ بڑھا دیتی ہے) چلیے۔

عادل: (اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر) ماہ رخ وعدہ کرو۔ کہ یہ ہاتھ مجھ

ماہ رخ: رسمٹ کر اس کے بازو سے پچنے کے لیے قدم اٹھاتی ہے، آئیے ادھر چلتے ہیں۔۔۔ آپ کا بربط کہاں ہے۔۔۔ لاتے نہیں آج؟

عادل: (جھک کر بربط اٹھاتے ہوئے) یہ تو میرے ساتھ ہمیشہ رہے گا ماہ رخ۔۔۔ یہ مجھے کتنا عزیز ہے تم کیا جانو۔۔۔ پتہ ہے کیوں عزیز ہے مجھے۔؟

ماہ رخ: (شوخ سے) میں کیا جانوں؟

عادل: یہ میرے دل کی آواز۔۔۔ میری روح کے سوز کو میرے محبوب تک پہنچانے کا وسیلہ بنا۔۔۔

ماہ رخ: اول ہوں۔۔۔

عادل: (رتار چھیڑتے ہوئے) ماہ رخ کی طرف جھک کر، انکار کر سکتی ہو، کیا رات رات بھر اس کے پُر سوز نغمے تمہارے دل میں ہلہل نہیں مچاتے رہے۔ کیا اس سے پھوٹے سرمے میں بے تاب نہیں کرتے رہے۔

تم مجھ تک پہنچنے کو مچلتی نہیں رہیں۔۔۔

ماہ رخ: (شوخ سے) بالکل بھی نہیں۔۔۔

عادل: (شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے) تو پھر کیسے تم مجھ تک پہنچیں۔۔۔ یہ درد یہ سوز تمہیں کچھ نہیں لایا۔

ماہ رخ: وہ تو آپ نے اس دن زبردستی میرا رستہ روک لیا۔ ورنہ میں۔

عادل: (سانوئی کو دعا دیتا ہوں جس نے راستے کا اشارہ دے دیا۔

ماہ رخ: اچھا تو اس آفت کی پرکالہ نے آپ کو یہ راستہ دکھایا۔

عادل: (بے خودی سے) وہ نہ بھی بتاتی۔ تو میرے جذبے راستے خود تلاش کر

لیتے ماہ رخ۔۔۔ اب تو مجھ میں صبر کا یا رانہیں رہا تھا۔۔۔ مچلی

پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔۔۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

(اٹھلا کر) اب حال کیسا ہے؟



سے کبھی نہیں چھوٹے گا — یہ میرا اور بالکل میرا ہے۔  
 ماہ رخ: (اس کے کندھے پر جھکتے ہوئے) جسم و جان کوئی چیز نہیں عادل —  
 ماہ رخ کی توجہ بھی آپ کی ہے۔  
 عادل: (جذبات سے سرشار ہو کر ہاتھ پر گرفت مضبوط کر کے لرزتی آواز میں)  
 ماہ — رخ — میری ماہ رخ —  
 ردوئوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے شانہ بر شانہ چلتے ہیں۔ مدہوش بے خود  
 گرد و پیش سے بے نیاز سے لگتے ہیں۔)

(شام کہاروں سے پھسلتی ہوئی میدانوں میں رات کا روپ دھار  
 رہی ہے۔ عادل اپنے کمرے نشست میں ایک مسند پر بیٹھا ہے اس کا  
 بربط اس کے قریب پڑا ہے۔ وہ اس کا اک اکھڑاتا مرمت کر رہا ہے  
 کمرے میں شمعیں جلا دی گئی ہیں۔ لیکن ابھی شام کی ڈوبتی روشنی بھی  
 کھڑکی سے اندر آرہی ہے — دروازے کا پردہ اٹھا کر مراد اندر  
 آتا ہے۔ اس کے کپڑے خاک آلود ہیں اور چہرے پر تنکان کے آثار ہیں۔)  
 عادل: (سراٹھا کر اسے دیکھتا ہے) آگئے۔ اتنی دیر لگا دی۔  
 مراد: (جھنجھلا کر) دیر سویر سے تمہیں کیا۔ تم اپنا بربط درست کرو۔ کہ شام ڈھل  
 چکی ہے اور رات قریب آرہی ہے۔  
 عادل: (ربط الگ رکھ کر) بہت غصے میں ہو دوست۔  
 مراد: (مسند کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے جوتے اتارتا ہے) عادل ہمیں  
 یہاں آئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔  
 عادل: تو پھر —  
 مراد: مجھے بار بار تمہیں یاد دلانا پڑے گا۔ کہ ہم اک مقصد کے لیے یہاں آئے  
 ہوئے ہیں۔ صرف محبت کے چکر چلانے نہیں آئے۔  
 عادل: میری محبت —

کی باتیں۔ فوج کی تعداد۔ اسلحے کے ذخائر۔ بہت سی دستاویزیں۔۔  
مراد: (جلدی سے) کیا واقعی؟

عادل: ہاں مراد۔ اب تو بابا کے دارالمطالعہ کی چابیاں بھی میرے پاس  
ہی رہتی ہیں۔ وہ مجھ پر اس حد تک اعتماد کر چکے ہیں۔ وہاں بابا کے  
بیشمار خفیہ کاغذات ہیں۔

مراد: بہت خوب۔

عادل: میں ساری دستاویزات کی نقول تیار کر رہا ہوں۔ فوجی اہمیت کے  
راز لکھ رہا ہوں۔ بابا نے یہ بھی بتایا ہے کہ ابوالحسن تانا شاہ یو جی  
مرہٹہ کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ یہ مرہٹہ سبزوار مغلوں کے لیے دوسرے  
بنا ہوا ہے۔

مراد: سب سے نیٹ لیا جائے گا۔

عادل: ریاست کے ہندو وزیر مدنا کی سازش ہے۔ جو وہ ان کی پشت پناہی  
کر رہا ہے۔

مراد: بیجا پور کو تو سزامل چکی۔ اب گوکنڈہ کی باری ہے۔ یہاں بھی ویسی  
ہی سازشیں ہیں۔ میں گھوم پھر کر کافی معلومات اکٹھی کر چکا ہوں۔  
مدنا اور قطب شاہ کا انجام بیجا پور کے۔ خاں اور سکندر عادل شاہ  
سے بھی برا ہوگا۔

عادل: ہونا چاہیئے۔ قطب شاہ کی خون میں لت پت لاش دیکھنے کی بابا کو ٹرپ  
ہے اور ہم بابا سے اس بات کا وعدہ بھی کر چکے ہیں۔

مراد: ایک بات ہے عادل۔

عادل: کیا؟

مراد: بابا ہم پر اعتماد ضرور کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ممب وطن ماننا پڑے گا۔  
کہ ضرور ہیں۔

مراد: (جوتے اتارنے کے بعد کمر کی پٹی کھولتے ہوئے بات کاٹ کر) میں نے  
تم سے کہا تھا۔ کہ تمہاری محبت ہمارے کام میں حارج ہوئی تو میں  
برداشت نہیں کروں گا۔

عادل: تم نے کیسے فیصلہ کر لیا۔ کہ میری محبت ہمارے کام میں حارج ہوئی ہے۔  
مراد: رات تم آستانہ عشق پر سر جھکائے اور دن رات کی تیاری میں گزار  
رہے ہو۔ اب تم بالکل تندرست ہو۔ کمزوری مانع نہیں ہونی چاہیئے۔

عادل: (مسکرا کر) تو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

مراد: جو آوارہ گردی میں کرتا پھرتا ہوں۔

عادل: (دل جمعی سے) کتنا مواد اکٹھا کیا۔؟

مراد: میں اکیلا جتنا کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔

عادل: (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر) اگر میں یہ کہوں کہ میں  
نے تم سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ کام کر لیا ہے تو پھر۔۔!

مراد: پھر میں یقین نہیں کروں گا۔ گھر میں بیٹھے تھیں۔

عادل: (مسکرا کر) اس گھر کی اہمیت تم بھول گئے کیا۔ مراد۔ میں نے  
سارا کام مکمل بھی کر لیا ہے۔

مراد: (حیران ہو کر) یقین کروں؟

عادل: تمہیں یقین کرنا پڑے گا۔

مراد: کیا کیا ہے؟

عادل: (ادھر ادھر دیکھ کر) ہم کمرے میں اکیلے ہیں نا۔ پہلے تسلی کرو۔

مراد: (اٹھ کر پردے ہٹا ہٹا کر اطمینان حاصل کرتا ہے۔ پھر عادل کے

قریب بیٹھ کر) ہوں کوئی نہیں ہے۔ کہو اب۔ کیا معرکہ مار چکے۔

عادل: بابا سے میں نے بہت ہی اہم معلومات حاصل کر لی ہیں۔ بابا نے

مجھے نقشے دکھائے ہیں۔ ریاست کے خفیہ نقشے۔ فوجی اہمیت

مراد : ٹھیک — تم یہ کام کرو۔ میں نقشوں کی مدد سے جگہوں کا تعین کر لوں گا — خفیہ راستوں تک پہنچنے کی کوشش کروں گا — میں نے گھوم پھر کر دیکھا ہے — کہ یہاں انتظامیہ بھی لاپرواہ ہے۔

عادل : حکمران کی عیاشی کا اثر ہے۔ اپنے دور حکومت کے ان سالوں میں وہ ایک بار بھی حیدر آباد سے باہر نہیں آیا۔

مراد : ہماری افواج کی ایک ہی یلغار کافی ہوگی۔

عادل : انشاء اللہ۔

مراد : محتاط رہنے کی یہی ضرورت ہے عادل — میں تمہیں ایک بار پھر نصیحت کرتا ہوں۔

عادل : شکریہ — رہنستے ہوئے، اب تو میں اپنا بربط درست کر سکتا ہوں نا۔

مراد : ضرور — ضرور — تم نے دل خوش کر دیا۔

(عادل بربط اٹھا لیتا ہے۔ مراد کپڑے بدلنے کے لیے پردے کے پیچھے چلا جاتا ہے)

عادل : ہاں —

مراد : اگر انہیں پتہ چل جائے کہ ہم دونوں مغل حکومت کے جاسوس ہیں تو۔

عادل : یقیناً سرقلم کر دیں (ہنستا ہے) جس مہم کو سر کر رہے ہیں۔ اس میں یہ خطرات شامل ہیں۔ رقد رے سنجیدہ ہو کر ایک بات کہوں مراد۔

مراد : کہو —

عادل : کبھی کبھی میرا ضمیر مجھے بے طرح ملامت کرنے لگتا ہے۔ میں بابا کے اعتماد کو دھوکا دے رہا ہوں — یہ خیال سوہان روح بن جاتا ہے۔

کسی کے خلوص و مروت کو دھوکہ دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔

مراد : ملک و ملت کے مفاد کے لیے یہ دھوکا جائز ہے۔

عادل : لیکن ضمیر کے کھڑے میں کھڑا ہونا بڑا مشکل ہے مراد —

مراد : ایسی باتیں نہ سوچو۔

عادل : دل چاہتا ہے بابا کو اپنے مقصد سے آگاہ کر دوں — ہو سکتا ہے وہ ہمارے اس سے بھی زیادہ کام آجائیں۔ وہ بھی تو والی کے دلی دشمن ہیں۔

مراد : دھوکہ کر دیکھتے ہوئے، تمہارا دماغ چل تو نہیں گیا۔ کہیں ضمیر کے ہتھے چڑھ کر ایسی حماقت نہ کر بیٹھنا — یوں بھی تم اس خاندان سے دلی نااطے جوڑ چکے ہو — کہیں جذبات میں بہک نہ جانا —

عادل : نصیحت کا شکریہ۔ شاید اب تک میرا ضمیر مجھے اظہار پر مجبور کر چکا ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات سے تسلی ہو جاتی ہے۔ کہ بابا اور مراد دو دنوں قطب شاہ کی تباہی کے متہمن ہیں۔

مراد : اور وہ اگر رہے گی — راٹھ کر پھلنے لگتا ہے، ہاں عادل —

کچھ اندازہ ہے کہ اور کتنے دنوں کا کام باقی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ دستاویز اور نقشوں کی نقول میں کتنا وقت اور لگے گا۔

عادل : چھ سات دن اور — نقشے تمہیں آج ہی دے سکتا ہوں۔

کرنا ہے۔

افشاں: جی بابا؛

بابا: (گہری سانس چھوڑتے ہوئے) ماہِ رُخ کی ماں حیات نہیں۔ اور نہ ہی اپنے ارد گرد مجھے کوئی اور مدبر عورت نظر آتی ہے۔ تم ماہِ رُخ کی بہن بھی ہو اور دوست بھی۔ تم پر ہی میری نظر رکتی ہے۔ تم زیادہ اچھی طرح اس کو سمجھ سکتی ہو۔

افشاں: آپ کس بارہ میں کہنا چاہ رہے ہیں بابا۔

بابا: میں ماہِ رُخ کی شادی کے متعلق سوچ رہا ہوں بیٹی۔ جوان بیٹی کا بارہے کندھوں پر۔ چاہتا ہوں جیتے جی آثارِ دلوں۔

افشاں: (سر جھکا کر) آپ ماہِ رُخ کی مرضی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

بابا: مرضی نہیں۔ میں اپنے انتخاب کی اس سے توثیق کروانا چاہتا ہوں۔

افشاں: آپ کا انتخاب؛

بابا: عادل۔

افشاں: (خوشی و مسرت سے دونوں ہاتھ ابھالیتی ہے) بابا!۔

بابا: (رخلاؤں میں دیکھتے ہوئے) عادل، خوب رُو، بہادر اور زندگی کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر بند آتما ہونے والا جوان ہے۔ مجھے بید پسند ہے۔

جہاں تک میرے تجربے اور سوچ بچار کا تعلق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ

عادل اس رشتے کا خواہاں ہے۔ گو وہ کھل کر کبھی بات نہیں کر پایا لیکن

شائستگی اور شرافت سے ہمیشہ ہی تاثر دیا ہے۔ کہ اس گھر کو اپنا کر اسے

دنیا میں جنت مل جائے گی۔ وہ بہت سلجھا ہوا انسان ہے۔ اس کا کردار

صیقل ہے۔ وہ بیجا پور کے ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ لیکن

بدقسمتی سے اس کا باپ زندہ ہے نہ ماں۔ اور اب تو بیجا پور بھی سلطنت

دہلی کے الحاق کی وجہ سے اس سے چھٹ چکا ہے۔ اسے یہیں

(ایک سادہ سی مسند پر بابا بیٹھے ہیں۔ پیچواں کی نئے ہونٹوں میں دبائے وہ کسی سوچ میں مستغرق ہیں۔ کمرہ سادگی سے آراستہ ہے بابا کا لباس بھی انتہائی سادہ لیکن باوقار ہے۔ دن زوال پذیر ہے کمرے میں لرزتی کانپتی روشنی بکھر رہی ہے۔ آہٹ پر بابا چونک کر دیکھتے ہیں۔ افشاں احترام سے سر جھکاٹے اندر آتی ہے۔)

بابا: آؤ بیٹی۔ بیٹھو۔

افشاں: رہ بیٹھے ہوئے دوپٹہ سر پر ٹھیک طرح سے جہاتے ہوئے، آپ نے

یاد فرمایا تھا بابا۔

بابا: ہاں۔

افشاں: فرمائیے۔

بابا: تم اطمینان سے بیٹھو۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔

افشاں: جی؛

بابا: پیچواں ایک طرف کرتے ہوئے مسکرا کر، تم گھبراہٹ کیوں گئیں۔ اطمینان رکھو۔

کوئی بری خبر تمہاری منتظر نہیں۔

افشاں: (سر قدرے جھکاتے ہوئے) میں واقعی ڈر گئی تھی بابا۔

بابا: (کچھ سوچتے ہوئے) مجھے تمہاری وساطت سے ماہِ رُخ کا عندیہ معلوم

رہنا ہے۔ یہیں رہنا پڑے گا۔

افشاں: (مؤدبانہ سب باتیں سنتی ہے، ہاں بابا۔

بابا: تم نے ماہ رخ کا عذیبہ معلوم کرنا ہے۔ ہمارے انتخاب کو وہ یقیناً قبول کر لے گی۔ پھر بھی اس کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔ تم دو چار دن تک ہمیں اس کے خیالات سے آگاہ کرو۔

افشاں: (خوشی سے بہت اچھا بابا۔ ماہ رخ کو بھلا اعتراض کیوں ہونے لگا۔ میں آپ کو مطلع کر دوں گی۔ کتنی خوشی کی بات ہے بابا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔

بابا: پہلے بہن سے پوچھ تو لو۔ پھر خوشیاں منانا۔

افشاں: آپ بے فکر ہیں بابا۔

بابا: تو پھر دو چار دن تک مجھے بتلا دو گی نا۔

افشاں: میں آج ہی۔۔۔ رکچہ سوچ کر چپ ہو جاتی ہے۔ پھر خوشی پر قابو پاتے ہوئے، ہاں بابا۔ میں آپ کو بتلا دوں گی۔

بابا: (بچپوں منہ سے لگاتے ہوئے) یہ بات خوش اسلوبی سے طے ہو جائے تو میرے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ پھر۔۔۔ پھر میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے جان بھی لٹا دوں گا۔ اپنے شجاع کا انتقام لے سکوں گا۔ اپنے بچے کے خون کا انتقام۔

افشاں: (ریا بکے جو شیلے تیر دیکھتے ہوئے، بس میں جاؤں بابا۔ جاؤں نا؟ بابا: بہت جلدی میں ہو۔ بہت مسرور دکھائی دیتی ہو۔

افشاں: (اٹھ کر جاتے ہوئے، ہاں بابا۔ خوشی کی بات تو ہے ہی۔ رپڑہ اٹھا کر بھاگ جاتی ہے۔ بابا بچپوں کی نے ہونٹوں میں دبائے سوچوں میں گم ہو جاتا ہے)۔

ماہ رخ ایک بیضوی آئینے کے سامنے اپنے حسن جہاں سوز کو محویت سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں کا مرکز اس کی اپنی آنکھیں ہیں۔ بڑی بڑی کشادہ آنکھیں۔ جن میں جادو جاگ رہا ہے۔ اس کے کالوں میں عادل کے الفاظ اتر رہے ہیں۔ تمہاری آنکھوں کے سحر نے مجھے اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا ہے ماہ رخ۔ وہ اس آواز سے مدہوش سی ہوئی جا رہی ہے۔ کمرے میں افشاں آ جاتی ہے۔ ماہ رخ کی پشت پر کھڑے ہو کر وہ اس کی محویت سے محفوظ ہوتی ہے۔ شام رات کی آغوش میں غنودگی کے عالم میں ہے۔ افشاں سمجھ جاتی ہے۔ کہ ماہ رخ رات کے انتظار میں گھڑیلوں کو یوں دھکیل رہی ہے۔ وہ دبے قدموں سے آگے بڑھتی ہے۔ اور چہرے پر قدرے ہراسانی اور گھبراہٹ کا تاثر پیدا کر لیتی ہے۔

افشاں: (خوف زدہ سی نظر آنے کی کوشش) ماہ رخ۔

ماہ رخ: (اطمینان سے رخ پلٹ کر) کیوں؟

افشاں: (اسی انداز میں) ماہ رخ!

ماہ رخ: (گھبرا کر) کیوں کیا بات ہے افشاں۔

افشاں: تمہیں معلوم ہے۔ چہرہ اور زیادہ افسردہ اور خوف زدہ بنا لیتی ہے)

تمہیں پتہ ہے؟

ماہ رخ: کیا؟

افشاں: بابا کو تمہارے اور عادل کے راتوں کو ملنے — کا پتہ چل گیا ہے۔

ماہ رخ: ایک دم حواس باختہ ہو کر افشاں — بیچ کہہ رہی ہو۔

افشاں: تو اور کیا — بابا ایک دم اتنے غصے میں ہیں کہ تمہیں کیا بتاؤں۔

ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے — وہ برس رہے ہیں —

بالکل خوفناک بادل کی طرح۔

ماہ رخ: ہائے اللہ رزد پڑ جاتی ہے،

افشاں: انہوں نے عادل اور تمہیں اس بات کی عبرت ناک سزا دینے کا ارادہ

کر لیا ہے۔

ماہ رخ: کیا؟ کیا سزا؟ — (دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان پکڑ لیتی ہے)

کیا سزا افشاں۔

افشاں: شاید رات نکھیں پھیلاتے ہوئے، شاید عادل کو زندہ دیوار میں چنوا دیں۔

ماہ رخ: نہیں — افشاں — بابا اتنے سنگ دل نہیں —

افشاں: بابا اسے اپنی عزت کا معاملہ سمجھ رہے ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہی ہے

انہیں اپنی عزت کتنی عزیز ہے — ایک ایسا اجنبی جس کے حسب

نسب کے متعلق کچھ علم ہی نہیں۔ ان کی بیٹی پر ڈورے ڈالے۔ بابا بھلا

یہ بات کیسے برداشت کرتے ہیں — رمنہ پھیر کر ہنسی روکتے ہوئے،

اور کرنی بھی نہیں چاہیے —

ماہ رخ: تم بھی بابا کی ہم لوا بن گئیں۔

افشاں: مجھے بھی اپنے خاندان کی عزت عزیز ہے۔

ماہ رخ: رات نکھیں پھیلا کر اسے دیکھتی ہے، افشاں —

افشاں: ہوں — ماہ رخ اسے دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے انداز

بدلتے لگتے ہیں۔ آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے)

ماہ رخ: میں نے محبت کی ہے۔ محبت جرم نہیں — گناہ نہیں۔ یہ سبائی کا

ایسا راستہ ہے۔ جس پر انسان بے دھڑک آگے بڑھ سکتا ہے۔ محبت

روشنی ہے نور ہے۔ اندھیرا نہیں کہ بھٹک جانے کا امکان ہو — مجھے

اپنے عشق کا اعتراف ہے — میرا وجود اس مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔

عورت کا وجود صدیوں سے اس مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ یہ چکر یہ گھماؤ

کبھی ختم نہیں ہوتا افشاں۔ یہ عورت کی فطرت ہے۔ اور میں بھی اک

عورت ہوں۔

ماہ رخ: منانیت سے قدم اٹھاتی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہو

جاتی ہے۔ افشاں آنکھیں ٹٹکا ٹٹکا کر ہنسی دبا دبا کر اسے دیکھتی ہے،

ماہ رخ: (قدرے مڑ کر) بابا اگر اپنی عزت کے لیے قربانی دینا ہی چاہتے ہیں۔

تو ان کے ہاتھ مجھ پر اٹھ سکتے ہیں۔ وہ زندہ مجھے چنوا دیں۔ کہ انار کلیاں

محبت کو دوام بخشنے کے لیے روایات کو شکست دے کر دیواروں میں چنی

جاتی رہتی ہیں —

افشاں: ادھر — عشق نے اس حد تک دیوانہ کر دیا۔ عادل کی جگہ اپنے

کو پیش کر دیا۔

ماہ رخ: تم نہیں جانتیں عادل میرے لیے کیا ہے۔ اس کے لیے ایک کیا

ماہ رخ، ہزار زندگیاں قربان کر سکتی ہے —

افشاں کھلکھلا کر ہنسی دیتی ہے ماہ رخ حیران ہو کر اسے دیکھتی ہے۔

پھر لپک کر اس کے قریب آتی ہے۔ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ

ڈالتی ہے —

ماہ رخ: تمہیں کیا ہو رہا ہے — پاگل تو نہیں ہو گئیں۔ بتاتی کیوں نہیں۔

افشاں: (پیارے سے اس کی ٹھوڑی چھو کر) میں نے مذاق کیا تھا ماہ رخ۔

افشاں: تو بابا سے کہہ دوں تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں (مسکراتی ہے)  
 ماہ رخ: (مسکراتے ہوئے شرمگین ادا سے) اگر تم چاہتی ہو کہ ماہ رخ حیات  
 سے اپنا ناطہ توڑ لے۔ تو بے شک بابا سے یہی کہہ دو۔  
 افشاں: (کمر پر ہاتھ رکھ کر) ہائے ہائے کتنی بے باک ہو گئی ہے یہ لڑکی۔  
 ماہ رخ: (اُسے دھکے دے کر کمرے سے نکالتے ہوئے) اب جاتی بھی ہو یا نہیں۔  
 افشاں: (واپس لوٹتے ہوئے) نہیں جاتی۔ آج تو میں جو تک کی طرح تمہارے  
 ساتھ چبٹی رہوں گی رسانی رات۔ عا دل بر لیا بجا بجا کر خود ہی  
 تھک ہار کر واپس چلا جائے گا۔ میں تمہیں نہیں جانتے دول گی  
 آج۔۔۔ سمجھیں۔۔۔  
 ماہ رخ: (مسکراتے ہوئے) پانی ہر رکاوٹ کے باوجود بہاؤ کی طرف بہنے سے  
 نہیں رکتا افشاں صاحبہ۔  
 افشاں: ہنسنے لگتی ہے۔ ماہ رخ کی مسکراہٹ بھی گہری  
 اور پرفوں ہو جاتی ہے۔)

ماہ رخ: رہا تھا اس کے کندھوں سے ہٹا کر منہ پھیر لیتی ہے، ایسا تلخ مذاق کرتے  
 کی کیا ضرورت تھی۔  
 افشاں: (اُس کے سامنے آکر) اس لیے کہ جو شیریں خبریں تجھے سنانے والی  
 تھی۔۔۔ اس کی مٹھاس اتنی زیادہ تھی۔ کہ۔۔۔  
 ماہ رخ: عاجز کر دیا ہے تم نے۔۔۔  
 افشاں: ماہ رخ آج بابا نے مجھے بلایا تھا۔  
 ماہ رخ: (اُسی سنجیدگی سے) تو پھر۔  
 افشاں: بتاؤں کیا کہا تھا انہوں نے۔  
 ماہ رخ: ضرورت سمجھتی ہو تو بتا دو۔۔۔ ورنہ خیر۔  
 افشاں: تم تو ناراض ہو گئیں۔  
 ماہ رخ: نہیں۔  
 افشاں: تو پہلے ہنسو، مسکراؤ۔۔۔ پھر بتاؤں گی۔  
 ماہ رخ: (مسکراہٹ روکنے کی لا حاصل کوشش) تم بہت شریر ہوتی جا رہی ہو۔  
 افشاں: بات ہی ایسی ہے۔  
 ماہ رخ: (رجل کر) اب بک بھی چکو۔  
 افشاں: پہلے بتاؤ کیا انعام دوں گی۔  
 ماہ رخ: تم ناخ میرا وقت ضائع کر رہی ہو۔  
 افشاں: بابا عادل کو اپنی فرزند ی میں۔۔۔ لینا چاہتے ہیں۔۔۔ کہو تمہیں  
 منظور ہے۔  
 ماہ رخ: (چہرہ حیا کی سرخی سے چمک اٹھتا ہے) بات تو فی کہیں کی۔  
 افشاں: اللہ قسم! بیع کہہ رہی ہوں۔ بابا تمہارا عند یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔  
 اب چیب کیوں ہو گئیں۔۔۔ اوہو شرمانے لگیں۔  
 ماہ رخ: ہٹو بھی۔



ہی آگ ہے۔ بابا کی نوازشات پہلے ہی مجھے جھلسا دینے کو کیا کم تھیں اس پر۔

مراد: (بات کاٹ کر) صورت حال کچھ ایسی پریشان کن تو نہیں۔ لیکن تم ضمیر ضمیر لیے پھرتے ہو۔۔۔۔۔ اب تمہیں اس سلسلے میں کوئی کیا دلاسیا تسلی دے عادل: محبت خلوص کی متقاضی ہوتی ہے اور تم جانتے ہو۔۔۔۔۔ اس معاملے میں خلوص کس طرح مجروح ہو رہا ہے۔ میرا ضمیر تو پہلے ہی مجھے معاف نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب۔۔۔۔۔ اب میں کیا کروں۔۔۔۔۔ بابا نے کس محبت پیارا اور خلوص سے مجھے اپنی فرزندگی میں لینے کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔ مراد: صرف یہیں تک سوچ محدود رکھو۔۔۔۔۔ کہ تمہاری دلی خواہش پوری ہو گئی۔

عادل: اودہ تم کتنے کورے ہو۔۔۔۔۔ مراد: تو پھر شائستگی سے بابا کے فیصلے کو لوٹا دو۔ عادل: (مراد کا منہ دیکھتے ہوئے) تم چاہتے ہو۔۔۔۔۔ میں وقت سے پہلے ہی مر جاؤں۔

مراد: تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا۔ عادل: میں بابا کے سامنے اعتراف جرم کر لوں گا۔۔۔۔۔ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یوں اور صرف یوں ہی میرا ضمیر چین پاسکتا ہے۔ محبت کے تعلق سے پورے ہو سکتے ہیں میں اب انہیں دھوکہ..... مراد: (اچانک ہاتھ اٹھتا ہے اور غصے میں وہ ایک بھر پور تھپڑ عادل کے گال پر مارتا ہے) غدار!

عادل (گال پر ہاتھ رکھ کر دانت ہونٹوں میں کاڑتے ہوئے) میری مجبوری کو دیکھو مراد۔۔۔۔۔ میری بے بسی پر رحم کھاؤ۔۔۔۔۔

مراد: (غصے سے) بکو اس بند کرو۔۔۔۔۔ میں پہلے بھی تمہیں کہ چکا ہوں کہ تمہاری

(بیرونی جھروکے میں عادل کھڑا ہے۔ وہ اتنا الجھا اتنا پریشان ہے کہ دیکھنے والے کو اس پر ترس آنے لگے۔ ہوائیں آواہ سی ہیں۔ بادل کے ٹکڑے نیلے آسمان کی آغوش میں ہندی بچوں کی طرح چل رہے ہیں۔۔۔۔۔ مراد اس طرف آتا ہے۔ وہ بارہا جانے کو تیار ہے۔ اپنے لباس کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے ادھر آتا ہے۔ عادل کو یوں مغموم دیکھ کر وہ بھی چند لمحے خاموش رہتا ہے۔۔۔۔۔ عادل اس کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ دوبارہ باہر دیکھنے لگتا ہے۔)

مراد: (اپنی کمر کے گرد لپٹی پٹی میں تلوار کا سرادرست کرتے ہوئے) عادل۔ عادل: ہوں۔

مراد: اس طرح تو کچھ نہیں بنے گا۔

عادل: (بے بسی سے) تو میں کیا کروں مراد۔۔۔۔۔ میں سخت ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوں۔ پچھندہ میرے گلے کے گرد اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ اب آواز بھی نہیں نکل پاتی۔۔۔۔۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔

مراد: میں نے تو روزِ اول ہی کہا تھا۔ عشق و شوق کا چکر اس نہیں آنے کا۔ تم نے میری سنی ہی نہیں آنکھیں بند کر کے آگ کے سمندر میں کود گئے۔

عادل: (بیچارگی سے) تم بچ کتے ہو۔۔۔۔۔ میرے چاروں طرف آگ



توانا نیت چیخ اٹھتی ہے۔ لیکن ہمارا کام اس سطح سے بہت اونچا ہے۔ ارفع و اعلیٰ۔ اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر سوچو۔ عادل۔

عادل: مراد۔ میں یہ سب باتیں سمجھتا ہوں۔

مراد: تو پھر ذرا ہمت مجتمع کرو۔ اور حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ دو۔ ہمیں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑنا۔ مکمل کرنا ہے۔ یہ ہماری ذات کا معاملہ نہیں۔ یہ ملکی مفاد ہے۔ اس مفاد پر ہزار محبتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ کیوں کہ یہ کام ساری محبتوں سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔

عادل: (سر جھکا کر) ضمیر بڑا بے رحم منصف ہے۔

مراد: (اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے) اس کڑی آزمائش سے ٹکرا جانا ہی آئین جو انمردی ہے عادل۔ بزدلوں کی طرح یوں ہتھیار ڈال دینا کم از کم تم جیسے انسان کے شان و ثناء نہیں۔ اول یا آخر یہ لو نہیں دھڑکتے اس گوشہ کے لو تھڑے کو نہیں کچلا ہی پڑے گا۔

عادل: (تڑپ کر) مراد۔

مراد: یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے آنکھیں بند کرنا خود کو دھوکا دینا ہوگا۔ تم دونوں صورتوں میں تباہ ہو چکے ہو عادل۔ ماہ رخ کو بتا دو جب بھی نہ بتاؤ جب بھی۔

عادل: (دونوں ہاتھوں پر چہرہ گر کر) تم شیخ کہہ رہے ہو تم شیخ کہہ رہے ہو۔

مراد: عادل! (شانہ تھپکتا ہے۔)

عادل: بربادی میرا مقدر بن چکی ہے (گہری آہ بھر کر) میں لٹ چکا ہوں۔

مراد: تمہاری حالت بے شک قابلِ رحم ہے۔ اپنے محبوب کی ممکنہ قربتوں کے باوجود تم اس سے صدیوں کے فاصلے پر ہو۔ رنگ و نور کا سیلاب تمہارے چاروں طرف مہر رہا ہے۔ لیکن تم لا متناہی اندھیرے میں گھرے ہو۔

محبت کا میں مارچ ہوئی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ تم بابا یا ماہ رخ کے سامنے اعتراف کر کے یہاں آنے کے مقصد پر ہی پانی پھیر دینا چاہتے ہو۔ کیا یہ منغل حکومت سے غداری نہ ہوگی۔ اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کی خاطر تم اپنی حکومت کو اتنا بڑا نقصان پہنچانے کی سوچ رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے تمہارے اعتراف پر حکومت کا راز نہ کھل جائے گا۔

عادل: (شرمندگی سے سر جھکا لیتا ہے) مراد!

مراد: (اسی لمحے میں) تم حلف اٹھا کر اس کام کا بیڑہ اٹھا چکے ہو۔ تمہارے قدم دم گمانے سے پہلے میں تمہیں ختم کر دوں گا۔

عادل: (سر جھکائے ہوئے) مجھے معاف کر دو۔ میں کش مکش کے جان لیوا عذاب سے گھبرا گیا ہوں۔ بابا کے فیصلے نے میرے ضمیر کو جھنجھوٹ ڈالا ہے۔ سوچو تو وہی میں کس اذیت سے دوچار ہوں۔

مراد: یہ سب باتیں تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھیں۔

عادل: تقدیر نے مجھے فرصت ہی کب دی۔ میری جگہ تم ہوتے، تو کیا کرتے مراد۔

مراد: میں محبت کو اپنے عظیم فرض پر بخوشی قربان کر دیتا۔

عادل: مراد! (بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا ہے)

مراد: (دل بیسج جاتا ہے) آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

مجھے معاف کرنا دوست۔ میرا ہاتھ تم پر اٹھ گیا۔ تم واقعی چچی کے دوپاٹوں میں پس رہے ہو۔ لیکن ہمت، حوصلہ اور بردباری سے کام

لینا چاہیے۔ حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ دو۔ تم ماہ رخ کو دیوانگی کی حدود سے بھی آگے نکل کر چاہتے ہو۔ میں جانتا ہوں۔ تم نے اب تک اپنے متعلق اسے کچھ نہ بتا کر اندھیرے میں بھی رکھا ہوا ہے۔ یہ ظلم

ہے مجھے خود بھی اس کا احساس ہے۔ محبت میں جب ایسا ظلم روا رکھا جائے

عادل: (بے چینی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے) یہ بد قسمتی ہی ہے نا۔  
 مراد: اس سے پنٹنے کا طریق سوچو — پریشان رہنے سے کچھ نہیں بنے گا — اپنے آپ کو اس وار کے لیے تیار کرو — ناکامی سے دوچار ہونے کے لیے اپنے ذہن دل و دماغ کو ہمہ وقت آمادہ رکھو۔ دو نہیں تو چار چار نہیں تو آٹھ دن تک ہمیں یہاں سے چلے جانا ہوگا۔ میرا کام تو تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ تم بھی میرے خیال میں سب کا غذا تیار کر چکے ہو۔  
 عادل: ہاں —

مراد: اب ہمیں واپس جانے کے متعلق سوچنا اور منصوبہ بنانا ہے۔

عادل: (ٹرپ جاتا ہے) واپس —؟

مراد: (اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے) ہاں عادل! ہمیں واپس جانا ہے۔ خوش فہمیوں میں مبتلا رہنا چھوڑ دو — اپنی ناکامیوں سے پنٹنے کی راہیں بناؤ —

عادل: مراد!

مراد: اس کی بے بس ٹرپ سے بے طرح مضطرب ہو کر اسے گلے سے لگالیتا ہے۔  
 میرے دوست! میرے عزیز بھائی!

(عادل چھوٹے سے بچے کی طرح اس کے کندھے پر اپنا سوچوں سے پریشان سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔)

— :: —

(چھوٹی سی مٹلیں نشستوں والی منقش کشتی ندی کے بہاؤ پر روانی سے چلی جا رہی ہے۔ ستاروں کا عکس لہروں میں کانپ رہا ہے۔ کناروں پر جھکے درخت لہروں کا سفر دیکھ رہے ہیں۔ ماہ رخ کا ہکا گلہابی ریشمی لباس ہوا کی جھیر سے حسین سرسراہٹیں پیدا کر رہا ہے۔ اس کے بالمقابل عادل بیٹھا ہے۔ ہاتھ چپو پر ہے۔ لیکن کسی سوچ میں ڈوبا ہے — آدھا چاند مینہ چرخ سے اپنی نامکمل روشنی بکھیر رہا ہے۔

ماہ رخ: (پریشان سی ہو جاتی ہے) عادل۔

عادل: (ایک دم چونک کر) کیوں ماہ رخ۔

ماہ رخ: آپ پریشان ہیں۔

عادل: نہیں — نہیں تو —۔

ماہ رخ: آج نہیں — بلکہ کئی دنوں سے میں آپ کو پریشان دیکھ رہی ہوں۔

یوں لگتا ہے جیسے آپ کسی ذہنی کوفت سے دوچار ہیں۔

عادل: (ماہ رخ کو غور سے دیکھ کر) یہ تمہارا وہم ہے ماہ رخ۔

ماہ رخ: (سنجیدگی سے) ہم دونوں جذبات کے بندھن سے نہیں بندھے عادل۔

ہمارا رشتہ اٹل پچائی اور خلوص کا رشتہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کی دھڑکنوں کی زبان سمجھتے ہیں — نظروں کو سمجھتے ہیں۔

بدل دو۔  
 ماہ رخ: کشتی واپس موڑیے (چہرہ ایک دم اتر جاتا ہے۔ نگاہیں اداس ہو جاتی ہیں۔)  
 آگے جانے کی ضرورت نہیں۔  
 عادل: (کرب سے) ناراض ہو گئیں۔  
 ماہ رخ: واپس چلیے۔

عادل: (بیچارگی سے) مجھ پر رحم کھاؤ ماہ رخ — میں کش مکش کی آگ میں جل رہا ہوں۔ میں بڑے نازک مسئلے سے نپٹ رہا ہوں۔ تم یوں میرا ساتھ نہ چھوڑو — مجھے سہارا دو — میں خطرناک موڑ پر کھڑا ہوں — تمہیں نہیں بتا سکتا کہ میں — میں — (گہری آہ کو روکتے ہوئے) میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بخدا اس وقت اس ذکر کو جانے دو — مجھے صرف چند دن کی مہلت دو — میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گا۔

ماہ رخ: (گھبرا جاتی ہے) معاف کرنا عادل میں نے آپ کو پریشان کیا۔  
 عادل: (آنکھیں بند کر کے ہنٹ کاٹتا ہے) تقدیر یہیں بعض اوقات کتنا مجبور کیسا پابند کر دیتی ہے — ماہ رخ — میں — میں فی الحال تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔  
 — تم کوئی اور باتیں کرو — کچھ اور سوچو — موسم کی باتیں کرو۔ ندی کی آغوش میں سما جانے والے تاروں بھرے آسمان کی باتیں کرو۔

ماہ رخ: (دکھی انداز میں) بہتر ہوگا ہم واپس لوٹ جائیں۔  
 عادل: (اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھتا ہے) ماہ رخ — ناراض ہو جاؤ گی۔ تو میں اس طرح ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا کہ تمہیں بلے کا ڈھیر بھی نہیں ملے گا۔

ماہ رخ: (گھبرا کر بات کاٹ دیتی ہے) یوں نہ کہو عادل۔  
 عادل: (اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر) میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں پریشان ہوں۔ ایسی عذاب دہ کش مکش میں ہوں جس کا عشرِ عشر بھی تم اپنے ذہن میں نہیں لاسکتیں — مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میری پریشانی براہ راست تم پر اثر انداز

عادل: (کانپ جاتا ہے) ادوہ! ماہ رخ!  
 ماہ رخ: (اسی آہنی سنجیدگی سے) ہمارے جذلوں کے تقدس اور خلوص اور سچائی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے آئینہ بن جائیں۔ کوئی سایہ، کوئی پردہ اس آئینے پر نہیں آنا چاہیے۔  
 عادل: ماہ رخ — کوئی اور بات کرو — (گھبراہٹ میں لبوں پر زبان پھیرنا

ہے)  
 ماہ رخ: تو آپ نہیں بتائیں گے۔  
 عادل: کیا —؟  
 ماہ رخ: یہی کہ کیا پریشانی ہے — جو آپ کے حواس کو مختل کیے ہوئے ہے۔  
 دیکھئے انکار کرنے کی گنجائش نہیں — آپ کی صورت غماز ہے آپ کی نگاہیں بننا ہی ہیں۔

عادل: (جبراً سکرا کر) تم ناحق پریشان نہ ہو۔  
 ماہ رخ: آپ کے یوں کہنے سے میری پریشانی تو ختم نہیں ہو سکتی — (ایک دم اس کی آنکھوں میں جھانک کر) عادل۔

عادل: ہوں —  
 ماہ رخ: کہیں تم بابا کے فیصلے سے تو پریشان نہیں۔  
 عادل: (بے اختیاری سے) ادوہ ماہ رخ — تم نے کتنی غلط بات سوچی — بابا کا فیصلہ تو میری زندگی ہے ماہ رخ — مجھ سا خوش نصیب دنیا میں کوئی نہیں۔  
 ماہ رخ: تو پھر!

عادل: کئی باتیں کئی وجوہ، کئی مسائل ہو سکتے ہیں۔  
 ماہ رخ: کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ ان مسائل، وجوہ اور باتوں کے متعلق آپ کا اعتماد حاصل کر سکوں۔

عادل: (پریشان سے پریشان تر ہو کر) خدا کے لیے ماہ رخ — باتوں کا رخ

مقام پر کوئی بھنور آجاتا ہے۔ کوئی چٹان ابھرتی ہے۔ انسان اس سے پریشان بھی ہو جاتا ہے۔ خلوص اور سچائی متقاضی ہوتے ہیں کہ راستہ صاف کیا جائے۔

ماہ رخ: خدا کرے تم اپنی کش مکش اور پریشانی سے جلد نجات پالو۔  
عادل: تمہاری محبت مجھے تھام لے گی ماہ رخ۔

ماہ رخ اپنا سر بھرا اس کے کندھے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر سکون کا پرتو ہے۔ عادل اسے سینے میں سمو لینے کے انداز میں قریب کر لیتا ہے۔ لیکن یک جائی اور قربت کے نقطہ عروج کے باوجود عادل کے چہرے پر سکون و اطمینان نہیں۔ خلا میں نظریں جمائے وہ مضطرب اور پریشان نظر آتا ہے۔



ہو رہی ہے۔ لیکن — میں مجبور و لاچار انسان — اس ضمن میں ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ماہ رخ: (عادل کے کندھے سے ہٹ کر اپنا سر لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔) یہ آزمائش کی کون سی منزل ہے عادل — تمہارا سارا کرب، ساری اذیت میں اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔

عادل: (انتہائی بیچارگی، دکھ اور کرب سے ماہ رخ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیتا ہے۔) ماہ رخ — میری روح — میری زندگی — (بے خودی سے) تم نے مجھے اور الجھا دیا ہے عادل — کیا اس تانے بانے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں — تم اتنے مایوس کیوں ہو۔

عادل: (بے تابی سے اسے اپنے اور قریب کر لیتا ہے) ماہ رخ۔  
ماہ رخ: کہیں مستقبل کی کوئی خوشی تو ہم پر سایہ ڈالنے کو نہیں بڑھ رہیں۔ (عادل کا گریبان ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے) عادل تم اپنی محبت میں ایمان داری سے ثابت قدم تو رہو گے نا۔

عادل: میری محبت پر شک نہ کرو ماہ رخ — فنا کی منزل سے عادل بہت پہلے گزر چکا۔ اس لمحے جب بے ہوشی میں ڈوبتی نظروں نے تمہارا رخ زیبا دیکھا تھا — عادل کی اپنی ہستی تو اسی جاگتے لمحے فنا کی پلیٹ میں آگئی تھی — یہ عادل تو تمہاری ہی ذات کا حصہ ہے ماہ رخ۔ تمہارے سہارے

جی رہا ہے۔

ماہ رخ: (سراٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے مسکرا کر) تمہارے جذبات کے تقدس و پاکیزگی کو میں جانتی ہوں۔ تمہاری محبت کی بلندی کو میں دیکھتی ہوں — تمہارے عشق کی انتہا کو میں محسوس کرتی ہوں۔

عادل: (قدرے سنبھلتے ہوئے) تقدس و پاکیزگی کو تکمیل تک پہنچانے۔ بلندی کو چھونے اور انتہا کو پانے کے راستے دشوار گزار ہوتے ہیں۔ کسی مرحلے کسی

افشاں : اودہ — اچھا — شاید خوشی کی انتہا میں تمہیں شجاع بھائی کی یاد شدت سے آنے لگی ہے۔ یہی بات ہے نا —

ماہ رخ : (گچہ سم سی) ہوں۔  
افشاں : (اے پیارے پنا کر) میں یہ تو نصیحت نہیں کر سکتی کہ خوشی کے لمحوں کو تم غم کی شدتوں سے الگ کر دو — لیکن تمہیں احساس ہونا چاہیے — تمہاری خوشیوں کا پلڑا بھاری ہے۔ تمہارا محبوب تمہارا عادل تمہارے بھائی کے خون کا انتقام لینے کی قسم کھاتا ہے۔ تمہارا اور بابا کا کٹنا دکھ بانٹ لیا ہے اس نے یہ عہد کر کے۔

ماہ رخ : ہاں !

افشاں : تو پھر — اتنی پریشان تو نہ رہا کرو۔  
ماہ رخ : افشاں — مجھے پریشانی اس بات سے نہیں —  
افشاں : تو پھر کیا ہے ؟  
ماہ رخ : عادل کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔

افشاں : (جلدی سے) کیا ہو گیا ہے۔  
ماہ رخ : وہ ان دنوں اتنا پریشان رہتا ہے کہ تمہیں بتانا نہیں سکتی۔  
افشاں : وجہ ؟

ماہ رخ : میرے اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہیں بتایا۔  
افشاں : شاید سے اپنی عزیز الوطنی کا احساس ہو۔ ماں باپ کی محرومیت کا خیال ستانے لگا ہو۔ خوشی کے موقعوں پر تو بھولی بسری محرومیتیں بھی جاگ اٹھتی ہیں۔  
ماہ رخ : (تذبذب سے) ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس ضمن میں تو میں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔

افشاں : اس کی محبت پر تو تمہیں شک نہیں نا ؟  
ماہ رخ : عادل مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے افشاں — اس کی دیوانہ محبت اب

(ماہ رخ شجاع کی قبر پر چراغ روشن کر کے کتنی ہی دیر گم صدم بیٹھی رہتی ہے۔  
اس کی حیران آنکھوں میں جامہا اضطراب ہے۔ وہ اکیلی بیٹھی ہے۔ رات جھک آئی ہے — وہ یوں بیٹھی ہے جیسے گرد و پیش سے بے خیر ہو — افشاں اس کی تلاش میں ادھر آنکلتی ہے —)  
افشاں : ماہ رخ ! تم یہاں بیٹھی ہو — کہاں کہاں میں نے تمہیں نہیں ڈھونڈا۔  
ماہ رخ : (چونک کر) اودہ — تم افشاں — (اٹھتے ہوئے) بس میں آنے ہی والی تھی —

افشاں : رات کتنی ڈھل آئی ہے —  
ماہ رخ : بعض اوقات انسان وقت کی بندشوں سے آزاد ہونے کا حیلہ کرتا ہے۔  
افشاں : تمہیں کیا ہو گیا ہے ماہ رخ — دن رات الجھی رہتی ہو۔ شجاع بھائی کی موت نے بھی تمہیں اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ نہ کیا تھا۔  
ماہ رخ : چلو جلیں۔

(دونوں نکل کر کھلے آسمان کے نیچے آجاتی ہیں۔ شانہ بشانہ چلتی ہیں —)  
افشاں : ماہ رخ — تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو — تمہیں تو خوش ہونا چاہیے —  
تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔ جسے تم نے چاہا — اسے پالیا —

ماہ رخ : ہاں

کسی اظہار کی محتاج نہیں رہی — صادق جذلوں پر ایمان نہ لانا ان کی توہین کے مترادف ہے افشاں۔

افشاں: (تسلی دیتے ہوئے) تو پھر تمہیں تو یوں اپنے سے بیگانہ بننے کی ضرورت نہیں — تم تو پریشانیوں کو اپنے اوپر مسلط ہونے کی دعوت دیتی ہو ماہ رخ: میں کیا کروں — میرے بس میں نہیں۔

افشاں: جذباتی تو تم ہو ہی — اب ذرا اپنے آپ پر قابو رکھا کرو۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے والی ہو — حوصلے، ہمت اور بردباری ہی کام آتی ہیں اس زندگی میں —

ماہ رخ: (قدرے مسکرا کر) تم تو جیسے اس زندگی کا تجربہ رکھتی ہونا —

افشاں: تم سے بہر حال بہتر ہی ہوں۔

ماہ رخ: تو پھر بابا سے کہہ دوں۔

افشاں: کیا؟

ماہ رخ: حسن خان کو جلدی بلا بھیجیں۔

افشاں: (شرملا کر) ہٹو — بڑی آئیں۔

ماہ رخ: اپنی دفعہ نام سے ہی شرمائیں — ویسے بتادوں — اوائل سرما

میں بابا تمہیں بھی پار کر دیں گے — حسن خان آرہا ہے — وہ مزید

انتظار نہیں کر سکتا —

افشاں: (اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے) جلدی جلدی قدم اٹھاؤ۔ رات کتنی ڈوب

چکی ہے — مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

ماہ رخ: جھوٹ کہیں کی — اندھیرا تناخوف ناک بھی نہیں — تاروں کی ٹھنڈی

روشنی میں میرا توجہ چاہتا ہے اب تک رکی رہوں —

افشاں: تو تم رہو اکیلی — میں جا رہی ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔

ماہ رخ: حسن خان کی یاد سے لپٹ کر سونا چاہتی ہونا — ٹھیک ہے جی پرانا

عاشق زار ہے بچپن کا منگیترا —

افشاں: (بات کاٹ کر) ماہ رخ بس بھی کرو — شیخ کتنا سنان علاقہ ہے۔

ماہ رخ: میں تو روز یہاں آتی ہوں۔ پہروں یہاں گھومتی پھرتی ہوں۔

افشاں: عادل کے ساتھ آتی ہونا —

ماہ رخ: (مسکرا کر) آج تمہارا ساتھ ہی —

افشاں: اللہ اب جلدی جلدی قدم اٹھاؤ نا — خدا قسم مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس

سامنے والی شکستہ دیوار سے تو مجھے دن کی روشنی میں بھی ڈر لگتا ہے۔ بابا اسے

گروا کیوں نہیں دیتے۔

ماہ رخ: ہو سکتا ہے بابا کے ماضی کی کوئی خوبصورت یاد اس دیوار سے وابستہ ہو

— میں نے بھی کئی دفعہ بابا سے کہا ہے۔ اس اکیلی دیوار کو باغ میں سے

ہٹوا دیں۔ لیکن مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں —

افشاں: ذرا ہٹ کر چلتے ہیں۔

ماہ رخ: پگلی — دیوار ہی ہے نا — ڈرنے کی کیا بات ہے۔

افشاں: بس مجھے ڈر لگتا ہے۔

ماہ رخ: تو پھر آج میں تمہیں اس دیوار کے ساتھ ساتھ لے کر چلوں گی۔ یہیں سے

حوٹلی تک جائیں گے۔

افشاں: میں نہیں جاؤں گی۔

ماہ رخ: تمہیں میری قسم آؤ —

افشاں: (رک کر) ایسی باتوں میں قسم کھانے کی کیا تک ہے۔

ماہ رخ: تم آؤ — اس طرح تمہارے ذہن سے جو خوف چپکا ہوا ہے۔

ختم ہو جائے گا۔

ماہ رخ: (افشاں ڈرتے ڈرتے ماہ رخ کے ساتھ چلتی ہے۔ اس نے مضبوطی سے

ماہ رخ کا ہاتھ تھام رکھا ہے — اچانک دونوں چونک کر ایک دوسرے

کی طرف دیکھتی ہیں۔ دیوار کے دوسری طرف کسی کے باتیں کرنے کی آواز ہے۔  
افشاں: (ڈر کر) کوئی ہے!

ماہ رخ: کیا ہوا۔ کوئی باغ کا رکھوالا ہوگا۔ پہرے دار ہوگا۔  
افشاں: باغ کے رکھوالے اور پہرے دار کو سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی  
کیا ضرورت ہے۔

ماہ رخ: واقعی۔ تم خاموشی سے جلتی آؤ دیکھتے ہیں کون ہے۔ وہ تنگن  
ہے نا اس میں سے دوسری جانب دیکھ کر پتہ چلے گا۔

افشاں: نہ جاؤ ماہ رخ۔

ماہ رخ: تم خاموشی سے جلتی آؤ۔

دونوں دروازہ تماشگاہ میں داخل ہوتی ہیں۔ چند انجھوں کے خالصے پر دو  
سایے ہیں۔ ماہ رخ کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ عادل اور مراد ہیں۔  
وہ کچھ کہتا ہی جا رہی ہے کہ دونوں کی آواز سے چپ ہو جاتی ہے۔ افشاں  
کو منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے۔ ان کے لب و لہجے سے  
محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی اہمیت کی گفتگو کر رہے ہیں! :-

— :- —

(ماہ رخ اور افشاں کی موجودگی سے بے خبر دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ عادل  
کی آواز افسردہ ہے۔ مراد قدرے جوش میں ہے)  
مراد: یہ حاققت ہوگی عادل۔ یہاں رہنا تمہاری یقینی ہلاکت ہے۔ یہاں جاسوس  
کو زندہ گاڑ دیا جاتا ہے۔  
عادل: تم اس کے متعلق کچھ نہیں سوچو۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔  
مراد: میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہیں یوں مصائب و آلام کے سمندروں میں غوطے  
کھانے کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اتنی بے رحم موت مرنے کو نہیں چھوڑ سکتا۔  
عادل: پاگل نہ بنو۔  
مراد: یہی الفاظ میں تم سے کہتا ہوں۔ میرے ساتھ تم بھی آج یہاں سے  
فرار ہو گے۔

عادل: ہنکار کا وقت نہیں مراد۔ میں نے سارے کاغذات ترتیب دے لیے  
ہیں۔ تم نے بھی سارا کام ختم کر لیا ہے۔ معلومات کا یہ ذخیرہ لے کر آج رات  
تمہیں سرحد پار کر جانا ہے۔ سمجھے۔  
مراد: تم یہ حکم مجھ پر نہیں ٹھونس سکتے۔  
عادل: حکم نہ تو استدعا ہی سی۔ بہر حال آج رات کے پچھلے پیر تمہیں یہاں  
سے فرار ہو جانا ہے۔



دبا ہوا ہوں — ماہ رخ سے اب میں کب تک بہانے بنا کر اپنی پریشانیاں مستور رکھوں مراد — اب دھوکہ اور فریب اس نقطے پر پہنچ چکے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے از خود پھٹ جائیں گے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تم آج رات یہ علاقہ چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ — ایسا نہ ہو کہ میری جذباتی لغزش سے بنانا یا کام بگڑ جائے۔ تم آج چلے جاؤ۔

مراد : عادل تم یہاں رہ کر کیوں بربادی کو گلے لگانا چاہتے ہو۔  
عادل : (زہر خند) بربادی تو ہو چکی — میرا ہر سانس زخمی ہے۔ میرا سینہ فگار ہے — تمہارے جانے کے بعد میں اعتراف جرم کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔

مراد : تم پاگل ہو چکے ہو —! ماہ رخ کی نفرت اور بابا کے عتاب کو سہہ گزرو گے۔

عادل : میں اسے اپنے کئی کی سزا سمجھ کر سینے سے لگا لوں گا — جین سے متو سوں گا۔ روح پریرہ بوجھ تو نہ ہو گا کہ میں نے محبت میں خلوص کا گلا کاٹ کر سزا نہیں پائی — میں ماہ رخ کو تباہوں گا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھ رہی ہے میں بھٹکا ہوا راہی نہیں مغل حکومت کا جاسوس ہوں۔ میں بیجا پور کا نہیں۔ دہلی کا رہنے والا ہوں۔ بے یار و مددگار نہیں بھرے پرے خاندان کا نرہ ہوں —

مراد : (بیچارگی سے) عادل اپنے والدین کے لیے، چھوٹی بہنوں کے لیے پیارے بھائیوں کے لیے فیصلہ بدل ڈالو — وقت کا مرہم محبت کا گھاؤ بھر دیا۔  
عادل : (زہر خند) افسوس کہ اتنے قریبی اور جگری دوست ہو کر بھی تم میری محبت کا اندازہ نہ کر سکتے۔ میری زندگی کی ابتدا و انتہا ماہ رخ ہے مراد میں اسی کیلئے زندہ ہوں اور اسی کے لیے مرجاؤں گا۔

مراد : عادل۔

عادل : اچھا یہ باتیں چھوڑو — ہاں تو آج رات کے پچھلے پیر میں نہیں یہاں سے

مراد : تو تم سنجیدگی سے کہہ رہے ہو کہ میرے ساتھ نہیں چلو گے۔  
عادل : تم ایسے بودے دماغ کے تو نہیں ہو جو میری بات نہ سمجھ سکو۔ میرے ذمہ جو فرض تھا۔ میں نے پورا کر دیا۔

مراد : مجھے احساس ہے کہ اپنی کرب ناک اذیتوں کے باوجود اک بہادر انسان کی طرح تم نے اپنے جذبات کو شکست دے کر مغل حکومت کے لیے پوری ایمان داری سے کام کیا ہے۔ تم جیسا مخبر پورے ہندوستان میں نہیں مل سکا۔  
عادل : شہنشاہ عالمگیر نے جو خدمت مجھے سونپی تھی شکر ہے ثابت قدمی سے میں نے نباہ دی — یہ سارے خفیہ راز — فوجی اہمیت کی خبریں، ذخائر کے مقام نقشہ جات میں نے اکٹھے کر کے رکھ لیے ہیں۔ آج رات تم انہیں لے کر سرحد پار کر جاؤ۔

مراد : آج ہی رات؟

عادل : ہاں مراد — اب میں اپنی ناکامی سے لڑتے لڑتے ہار چکا ہوں۔ ضمیر کی آواز اب چیخ بن کر پھٹ جانے کو ہے — ڈرتا ہوں ایک دن بھی اور نہ گزر سکے گا۔ بہتری اسی میں ہے — کہ تم آج رات یہاں سے نکل جاؤ۔  
یہ معلومات ضرورت سے زیادہ ہیں مغل حکومت کی راہنمائی کو بہت ہیں۔ اب مغل فوجیں آنکھیں بند کر کے ان معلومات کے سہارے گو کھنڈہ پر برق بن کر گر سکتی ہیں —

مراد : گو کھنڈہ کی حالت بیجا پور سے بہت نازک ہے۔ محاصرہ طویل نہیں پکڑے گا۔ والی کو حملہ ہوتے ہی ہتھیار ڈال دینا پڑیں گے۔

عادل : خدا ہماری فوج کو کامیابیوں سے ہم کن کرے۔

مراد : عادل تم یہاں رہ کر اک سنہرے مستقبل کو ٹھکرا رہے ہو — جانتے ہو ہماری ان خدمات کا صلہ کتنا حوصلہ افزا ہو گا۔

عادل : میری نظروں میں ماضی ہے نہ مستقبل — میں تو حال کے غونی دانتوں میں

نکال کر لے جاؤں گا۔ اس رہائش گاہ کا عقیقہ دروازہ اس راستے پر کھتا ہے جو سرحد سے قریب اور محفوظ ترین ہے۔ گھوڑوں کا بندوبست میں کرج کا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ سرحد تک چلوں گا۔

مراد: (عادل سے لپٹ جاتا ہے) عادل — میرے بھائی! —  
عادل: (غزورہ آواز میں) میرے دوست۔

(چند لمحے دونوں لپٹے کھڑے رہتے ہیں — پھر آہستگی سے دونوں الگ ہوتے ہیں)۔

عادل: چلو اب چلیں — میں نے یہی بتانے کو تمہیں یہاں بلایا تھا۔

مراد: میری ہمت تمہارے بغیر ٹوٹ نہ جائے۔

عادل: پاگل نہ بنو — میں سرحد تک تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ سرحد پار کرنے کے بعد تمہیں کوئی خدشہ درپیش نہ ہوگا۔

مراد: مجھے ان غدشوں کی پروا نہیں۔ مجھے تو تمہارے چھٹ جانے کا غم ہے۔

عادل: غم جھیلنے کا تو تم نے ہمیشہ مجھے سبق دیا — اب کیسی باتیں کر رہے ہو — چلو — چہرے پر ہنسنے کے آثار پیدا کر لو — بایا کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی چاندیدہ نظریں سمجھ جائیں۔

مراد: کہ ہم پردہ سی نہیں مغل حکومت کے زیرک جاسوس ہیں (ہنستا ہے)

عادل: اچھا اب ان باتوں کو چھوڑو — رات کی تیاری کرو۔ کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلے جانا — میں بھی آج اپنے کمرے میں رہوں گا۔ رات آدھی گزر جائے گی تو میں تمہیں لے کر عقیقہ دروازے سے نکل جاؤں گا۔

مراد: بہت بہتر — (گہری آہ بھر کر) خدا تمہارا حافظہ نگہبان ہوگا۔

عادل: (مسکرا کر) ان دعاؤں کا میں مستحق ہوں نہ طالب۔ ہاں میرے یہی جذبات پوری صدق دلی سے تمہارے لیے ہیں — آؤ — چلیں —

(دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہاں سے باتیں کرتے ہوئے چل دیتے ہیں)۔

(کمرے میں فانوسوں کی روشنی جگمگا رہی ہے۔ تالین پردے مسدیں مسہری ہر چیز جاندار سی چمک لینے ہوئے ہے۔ چاندی کے گلدانوں میں صبح کے رکھے ہوئے پھول اس وقت اپنی بہار کھو چکے ہیں۔ پھر بھی روشنی میں ان کی اڑتی بہار کی کمزور خوبصورتی نرالی سی لگ رہی ہے۔ سانولی ماہ رخ اور افشاں کے کھانے کے خوان لیے بیٹھی ہے۔ ماہ رخ ابھی تک شجاع کی قبر پر چراغ روشن کر کے نہیں لوٹی — سانولی اٹھ کر دروازے تک جاتی ہے۔ لیکن باہر جانے سے پہلے ہی ٹھٹک جاتی ہے — افشاں ماہ رخ کو ہنسنے لگا رہی ہے۔ افشاں کا چہرہ بھی فقی ہے۔ آنکھیں حیرت سے بھٹی ہیں۔ قدم لڑکھڑا رہے ہیں — لیکن ماہ رخ کی حالت دگرگوں ہے۔ جیسے جان کنی کے عالم میں ہو — چہرہ لاش کی طرح سیدھ ہے۔ سانولی آگے بڑھ کر اسے افشاں کے کندھے سے گرتا دیکھ کر تھام لیتی ہے — دونوں ماہ رخ کو اندر لاکر مسہری پر لٹا دیتی ہیں۔ ماہ رخ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں)۔

سانولی: (گہرا کر) کیا ہوا انہیں — (جلدی سے جوتے اتارتی ہے پاؤں ملتے ہوئے) ہائے اللہ — کچھ بتائیے نا — انہیں کیا ہو گیا —

(افشاں پٹی کے قریب سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہے — سانولی ماہ رخ کا چہرہ ہاتھ سے چھوتی ہے)۔

سانولی: (بے طرح گہرا کر) انہیں کیا ہوا ہے بی بی — کچھ بتائیے نا — حکیم

صاحب کو بلاؤں دیکھیں نا — چہرہ کس قدر سپید پڑ گیا ہے۔ ہونٹ نک پیلے ہو گئے ہیں — نصیب دشمنان —

افشاں: (ڈوٹی آواز میں) خاموش رہو سانولی۔  
سانولی: آفا کو بلا لاؤں۔

افشاں: میں نے کہا ہے تم خاموش رہو —

سانولی: (دگھراہٹ میں ہاتھ ملتے ہوئے) لیکن بانو —

افشاں: (غصے سے) کہہ دیا ہے خاموش رہو — نہیں رہ سکتیں تو کمرے سے نکل جاؤ۔

سانولی: (روہانسی ہو کر) ہائے اللہ —

افشاں: (ماہ رخ پر جھک کر) ماہ رخ!

ماہ رخ: (آنکھیں کھول دیتی ہے) — پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ چاروں طرف پاگلوں کی طرح دیکھتی ہے۔ پھر آنکھیں ملتی ہے — افشاں — میں نے خواب تو نہیں دیکھا۔

افشاں: (سر جھکا کر) خواب اتنے زہرناک نہیں ہوتے —

ماہ رخ: (دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتی ہے) — میرا سر چکر رہا ہے افشاں — مجھے کچھ سوجھ بوجھ نہیں رہا — مجھے کیا ہو رہا ہے — میرا دل بیٹھا

جا رہا ہے —

افشاں: (خود بھی بریشان ہے) لیکن ماہ رخ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے) لیٹ جاؤ — کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔

ماہ رخ: (دیلنے کی بجائے اٹھ کر قالین پر چلنے لگتی ہے) — وہ اپنی کپٹیاں سلاتی ہے۔ آنکھیں کبھی کھولتی کبھی بند کرتی ہے — پھر ایک دم زور زور سے چیخنے لگتی ہے،

افشاں — افشاں — افشاں — (نشستی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے)۔

افشاں: (آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں) — ماہ رخ! بند احوال نہ بارو۔

اے لپٹا لیتی ہے۔

ماہ رخ: (اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے) افشاں یہ کیا ہو گیا افشاں۔

کہہ دو یہ سب حقیقت نہیں خواب تھا —

سانولی: خدا کے لیے کچھ مجھے بھی بتائیے۔

ماہ رخ: (سانولی کی طرف روتی آنکھوں سے دیکھ کر) کیا پوچھتی ہے سانولی،

— تجھے کیا بتائیں — کیوں کرتائیں — تو نے بھی کچھ نہ سمجھا —

تو نے بھی کچھ نہ جانا —

سانولی: (سخت گھبرا کر) بانو — کچھ مجھے بھی تو سمجھائیے —

ماہ رخ: عادل کی آواز تو ہی مجھ تک پہنچاتی رہی ہے — تو ہی اسکی بیٹا میر

بنی رہی ہے —

سانولی: تو — تو کیا ہوا انہیں —

ماہ رخ: وہ — وہ —

افشاں: (بات کاٹ کر جلدی سے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے) ماہ رخ

— (پھر سانولی سے) تم جاؤ سانولی —

ماہ رخ: افشاں — (زندگی آواز سے) سانولی ان محبتوں کی امین ہے افشاں جو

میرے اور عادل کے درمیان جتنی رعنائیاں بن کر بہہ رہی تھیں۔ اے بھی معلوم

ہو جانے دو کہ عادل کتنا جفا کار، کتنا غا باز — کتنا خود غرض اور فربہ انسان

ہے —

سانولی: (حیرت سے آنکھیں پھٹ جاتی ہیں، دل دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی

ہے) — یہ — یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بانو — عادل صاحب — ایسے

نہیں ہیں —

ماہ رخ: (پتھر اے ہوئے انداز میں) اس نے ہم سب کو لوٹا ہے سانولی۔ بابا کے

اعتماد میری محبت اور تمہارے بھروسے سبھی کو دھوکہ دیا ہے۔

سانولی : بانو! یہ کیسے کہہ رہی ہیں آپ — وہ —

ماہ رخ : (تلی سے) وہ مغل حکومت کا جاسوس ہے سانولی۔ عادل اور مراد مجری کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بابا بیٹے کے خون کے انتقام کی دھن میں ہیں اور وہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

افشاں : (ماہ رخ کا چہرہ اپنی طرف کر کے) اسے کیا بتا رہی ہو۔

ماہ رخ : تو پھر کسے بتاؤں — افشاں — کے بتاؤں (اس کے کندھے پر سر رکھتی ہے) افشاں : میں ساری بات بابا سے کہہ دینی چاہیے (افشاں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہے)

ماہ رخ : ہاں — ساری بات بابا کو بتا دینی چاہیے۔ (دوبلے یقینی کے سے) (ماہ رخ پھر سے تابی سے ہاتھ ملتے ہوئے سیرکے لگی ہے)

افشاں : (بال عالم میں) ہاں — جاؤ دیکھو بابا اس وقت کہاں ہیں۔ سانولی : کھانا کھا رہے ہوں گے — تھوڑی دیر پہلے ہی نادہ ان کا کھانا نعمان خانے میں لے کر گئی تھی۔

افشاں : عادل اور مراد بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔

سانولی : جی ہاں۔ وہ کھانا کھٹے ہی کھاتے ہیں۔

افشاں : (متفکر ہو کر) تو پھر!

سانولی : کھانا کھا کر آقا کچھ دیر کے لیے دارالمطالعہ میں جاتے ہیں۔

ماہ رخ : تم جا کر بابا کے وہاں جانے کا انتظار کرو — جب وہ وہاں ہوں تو ہیں

آکر اطلاع دینا (اپنا پکڑتا ہوا سر تھام لیتی ہے) یا خدا — یہ کیا ہو گیا —

کاش میں کچھ نہ سنتی — کچھ نہ دیکھتی — کہہ دو افشاں کہ عادل دغا باز نہیں

— وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔

افشاں : (کنے کو جیسے کچھ باقی نہ رہا ہو) — ماہ رخ — سنبلو — ذرا

سنبلو — (سانولی چلی جاتی ہے۔ ماہ رخ چند لمحے بڑی دیوانہ جذباتی حرکتیں

افشاں : یہ دھرتی ہماری اپنی دھرتی ہے اس سے پیار کوئی دکھاوا نہیں۔

ماہ رخ : ہمیں والی سے دشمنی ضرور ہے۔ لیکن یہ دشمنی ذات تک محدود ہے۔ کوئی بیرونی طاقت ہماری غیرت اور ہماری آزادی کا سودا کرنے آئے تو ہم آپہنی چٹان بن کر اس کے راستے میں کھڑے ہو جائیں گے۔

(اٹھ کر بے تابی سے ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہے — افشاں حواس باختہ سی اسے دیکھتی ہے)

ماہ رخ : (افشاں کے کندھے پر سر رکھ کر سسکتے ہوئے) میں کس کڑی آزمائش میں آچھنی ہوں عادل! عادل! تو میری زندگی ہے افشاں! اس نے کیوں میرے

اعتماد اور خلوص کو یوں مسل ڈالا۔ میرے صادق جذبول کو۔ اتنا ظلم کرتے ہوئے اس کا دل پھٹ کیوں نہ گیا افشاں — کیوں دھوکہ دیا میری پاک محبت کو۔ کیوں دُند ڈالا۔

افشاں : (آنسو بہتے ہیں) — ماہ رخ — ہمت سے کام لو۔ میری مظلوم بہن

ہمت سے کام لو —

دماہ رخ افشاں کے کندھے سے لگی سسکتی ہے۔ اس کے نازک وجود کو

ہچکیوں سے جھٹکے لگنے لگتے ہیں۔ افشاں بھی روئے جاتی ہے —

ماہ رخ : (سر اٹھا کر دونوں ہاتھ ملتے ہوئے) میرا سر پکڑا رہا ہے۔ افشاں میں بابا

سے کیوں کر سب کچھ کہوں گی — میرا دل بیٹھ رہا ہے میری آنکھوں میں

اندھیرا چھا رہا ہے۔

افشاں : (اسے تھام کر بٹھاتے ہوئے) پانی لاؤں۔

ماہ رخ : (دیوانگی کے عالم میں) کیا یہ زہر میرے کانوں ہی میں ٹپکنا تھا یہ ہلاکت

آفرین حقیقت مجھ پر ہی منکشف ہونا تھی — کاش میں نہ سنتی افشاں —

کاش میں نہ سنتی — بابا سن لیتے ان دونوں کی باتیں۔

افشاں : (پریشانی سے) یہ بھی اچھا ہی ہوا — جو بابا نے نہ سن لیں۔ ورنہ خدا جانے

اسی وقت ان دونوں کا کیا حشر ہوتا —

کرتی ہے۔ پھر افشاں اسے مسند پر بٹھادیتی ہے۔ — وہ غلاؤں میں دیکھتی  
سوچوں کے الجھاؤ میں ساکت ہو کر بیٹھی رہتی ہے۔ — پھر بڑبڑانے لگتی ہے  
ماہ رخ : عادل کی پریشانی کی اب سمجھ آئی ہے مجھے — وہ اسی لیے پریشان تھا  
— میرے پوچھنے پر بھی نہیں بتاتا تھا۔ —

افشاں : (اس کے قریب بیٹھتے ہوئے خواب ناک آواز میں) محبت اور فرض کے  
جنگ تھی نا —

ماہ رخ : (آنکھیں سرخ اور چہرہ لال بھوکا ہو جاتا ہے) محبت؟ کیا اب بھی تم یہ قدس  
نام عادل کے نام کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہو۔

افشاں : اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے تم سے محبت ہے۔ —

ماہ رخ : (غصیلے لہجے میں) ایسا کہہ کر اب اس نازک جذبے کی توہین نہ کرو افشاں  
— مجھے — یہ کہنے دو — کہ محبت اسے صرف اپنے فرض سے تھی۔

اپنے وطن اپنی حکومت سے تھی — میری ذات پر محبت کی چھاپ لگا کر اس  
نے اپنے مقصد کو حل کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔

افشاں : (سر اسیمہ ہو کر) ماہ رخ۔ وہ اپنے کئے کی سزا پانے کو یہاں ٹھہر رہا ہے  
— اسے اس کی محبت روک رہی ہے۔ ورنہ اپنے دوست کے ساتھ

آج وہ بھی جاسکتا تھا۔ —

ماہ رخ : ہونہ — یہ اس کی خود غرضی ہے افشاں۔ شاید کوئی امید ابھی زندہ  
ہوگی — کیا وہ سمجھتا ہے — کہ سارا راز مجھ پر اگل کر وہ مجھ سے محبت

کی بھیک مانگ سکے گا۔ —

افشاں : تو — تو —

ماہ رخ : ماہ رخ گو کندہ کی بیٹی ہے افشاں — اس مقدس سرزمین کے ایک  
ذرے پر بھی آئینہ نہیں آنے دی جاسکتی۔ (اک مستحکم عزم کے ساتھ انہیں آنے  
دی جاسکتی آئینہ —

ماہ رخ : اس طرح مشترک تو نہیں گیا۔

افشاں : ماہ رخ — ذرا سنبھلو — آرام سے بیٹھ کر دل جمعی سے پہلے سوچو۔

— بابا کو سکون سے ساری باتیں بتانا — کیا عجب وہ انہیں معاف ہی  
کر دیں۔

ماہ رخ : (ٹرپ کر) افشاں — یہ گو کندہ کی عزت و ناموس کا سوال ہے اس کی  
آزادی کا سوال ہے۔ اس کی حرمت اور آبرو کا سوال ہے۔

افشاں : (گھبرا کر) تو کیا؟ کیا —

ماہ رخ : ان دونوں کو آج رات گرفتار کر لینا ہوگا۔

افشاں : (ہچک کر) ماہ رخ !

ماہ رخ : صرف گرفتاری نہیں — شاہی فوج کے حوالے کرنا ہوگا سلطان کے  
سامنے پیش کرنا ہوگا۔

افشاں : (دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہے) ماہ رخ — عادل تمہارا عشق ہے۔

ماہ رخ : عادل نے بھی عشق کو فرض پر قربان کر دیا ہے — ماہ رخ قربانی  
میں بخیل نہ ہوگی۔

افشاں : ماہ رخ۔

ماہ رخ : اپنی پیاری اور آزاد ریاست کے لیے محبتیں قربان کی جاسکتی ہیں افشاں —  
افشاں : (روبانسی ہو کر) تم عادل کے بغیر کیسے جی سکوگی۔

ماہ رخ : (زہر خند) ماہ رخ تو اسی لمحے مر گئی تھی — جب عادل بے نقاب ہوا  
تھا — اب مجھے سہارا دو کہ میں اپنے وطن عزیز کی خاطر اس کڑی آزمائش

سے گزر جاؤں — افشاں چپ کیوں ہو۔ کیا تمہیں اپنے دلیس کی آزاد فضاؤں  
سے پیار نہیں — کیا اس کی چمکتی صبحیں اور دھمکتی شامیں غلامی کے بار

سے گنا جانی چاہئیں —

افشاں : ہرگز نہیں — ہرگز نہیں۔

ماہ رخ : (اٹھتے ہوئے) تو آؤ چلیں بابا دارالمطالعہ میں آچکے ہوں گے۔

افشاں : (افسردگی سے) سانولی اطلاع دینے آئے گی۔

ماہ رخ : دیر ہو رہی ہے آؤ ہم بابا کے پاس خود ہی چلتے ہیں۔

افشاں : آؤ (ماہ رخ کے قریب آجاتی ہے۔ ماہ رخ کی حالت غیر ہے افشاں

گھبرا کر اسے دیکھتی ہے)

ماہ رخ : دنڈ سال سی ہو کر افشاں کے بازو پر جھکتی ہے، مجھے سنبھال لو افشاں،

سنبھال لو۔ (گری جاتی ہے۔ سارا بدن کانپ رہا ہے) افشاں میں

افشاں : ماہ رخ خدا کے لیے کچھ دیر لیٹ جاؤ تمہارے حواس مختل ہیں۔ بابا کو کچھ

بتانے سے پہلے ذرا پرسکون ہو کر سوچنے کی کوشش کرو۔ اتنی بڑی قربانی دینے

کی تمہیں ہمت بھی ہے یا نہیں۔ دیکھو تو کیا حال ہو گیا ہے۔ کچھ سکون پانے

کی کوشش کرو پہلے۔

ماہ رخ : (قدرے سنبھل کر) سکون — (زہر خند) سکون تو اب موت کی آغوش

ہی میں ملے گا۔ باقی سوچنے کا وقت بالکل نہیں — وقت گزر رہا ہے —

کام زیادہ ہے — ایسا نہ ہو۔ وقت سانپ کی طرح نکل جائے اور ہم کبیر

پیٹتے رہ جائیں — تم جانتی ہو آج رات مراد یہاں سے فرار ہو رہا ہے —

افشاں : بابا کو کچھ بتانے سے پہلے اچھا ہوتا۔ اگر تم عادل —

ماہ رخ : (تیزی سے بات کاٹ کر) عادل سے ماہ رخ کے سارے رشتے ٹوٹ

گئے ہیں — کوئی ناٹھ نہیں رہا — ہر ڈوری کٹ گئی — ہم دونوں نے سرے

سے اجنبی ہو چکے ہیں۔

افشاں : روح کے بندھن ٹوٹنا کچھ ایسا سہل نہیں ہوتا — تم رک جاؤ۔ بابا کے

پاس جانے سے پہلے سوچ لو۔

ماہ رخ : کیا تم مادر وطن سے غداری پر مجھے اکسارہی ہو۔

(افشاں مترندگی سے سر جھکا لیتی ہے۔ ماہ رخ کچھ کہنے کو بے کمر سانولی

اندرا آتی ہے)

سانولی : آمادارالمطالعہ میں تشریف رکھتے ہیں۔

افشاں : لیکے ہی ہیں نا۔

سانولی : جی ہاں — عادل اور مراد صاحب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے ہیں۔

(افشاں بازو کے سہارے ماہ رخ کو لے جانا چاہتی ہے۔ لیکن اب وہ

پُر غم ہے خود ہی چل دیتی ہے۔ افشاں اور سانولی ساتھ جاتی ہیں —

سانولی دروازے میں رک جاتی ہے۔ وہ دونوں آگے بڑھ جاتی ہیں —

— :: —

ماہ رخ: وہ آپ کے کئی راز چراچکے ہیں۔ خفیہ معلومات حاصل کر چکے ہیں بابا۔ اور آج رات مراد یہ سارا خزانہ لے کر گوکنڈہ کی سرحد پار کر رہا ہے۔

بابا: (پھر ہنس دیتا ہے) یہ خبر میرے لیے نئی نہیں بیٹی۔  
ماہ رخ: (حیرت سے) تو کیا؟ تو کیا آپ جانتے ہیں۔ کہ عادل اور مراد جاسوس ہیں مغل حکومت کے جاسوس۔

بابا: (سنجیدہ ہو کر) ہاں۔ مجھے شک تو شروع ہی سے تھا۔ لیکن چند دن ہوئے میں نے اس شک کی تقویت پالی۔  
ماہ رخ: آپ کو معلوم ہے۔ کہ عادل اور مراد جاسوس ہیں۔ مخبری کرتے یہاں آئے ہوئے ہیں؟

بابا: (راطمینان سے مسکراتے ہوئے) ہاں۔  
ماہ رخ: تو آپ نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا۔

بابا: نہیں!  
ماہ رخ: کیوں بابا؟ آپ نے انہیں ڈھیل کیوں دے دی۔ گرفتار کیوں نہ کریا۔  
بابا: (ہنس کر) اس لیے کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔

(ماہ رخ اور افشاں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جانے کی حد تک کھل جاتی ہیں۔)

ماہ رخ: (بابا کا کندھا جھنجھوڑ کر) بابا! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔  
بابا: ماہ رخ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی یہ تھکے سوچنے کی باتیں ہیں۔ افشاں بیٹی بہن کو لے جاؤ۔ اسے آرام سے سلا دو۔ بہت مضطرب نظر آرہی ہے۔

ماہ رخ بابا یہ باتیں اگر میرے سوچنے کی نہیں۔ تو آپ کے سوچنے کی ضرور ہیں۔  
افشاں: (رہے انداز میں) ہاں بابا۔ مغل ہمارے دشمن ہیں اور عادل۔

مرید حیدر کا دارالمطالعہ۔ فانوسوں میں شمعیں جل رہی ہیں۔  
چاروں طرف نایاب اور قیمتی کتابیں ترتیب سے چنی ہیں۔ بیٹھ کر مطالعہ کرنے کے لیے نشستیں ہیں۔ آرام دہ مسدیں ہیں۔ بابا اپنا بیچواں لیے ایک مسد پر بیٹھے ہیں۔ ماہ رخ ان کے سامنے ہر سال گھڑی ہے۔ قدرے ہٹ کر افشاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے بابا کو دیکھ رہی ہے۔ بابا جوان دونوں کے سنی خیز انکشاف پر حیرت زدہ ہونے کی بجائے اپنے زانو پر پڑی کتاب پر ہاتھ مار مار کر قہقہے لگا رہے ہیں۔ دونوں حواس باختہ لڑکیاں ایک دوسرے کو خوف زدہ ہو کر دیکھتی ہیں۔  
ماہ رخ آگے بڑھ کر بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔  
ماہ رخ: حیرت اور خوف سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ) بابا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔

بابا: بالکل ماہ رخ بیٹی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔  
ماہ رخ: تو پھر آپ میرے انکشاف پر ہنس کیوں رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ طفلانہ حرکت ہے۔  
افشاں: بابا ماہ رخ نے جو کچھ کہا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں نے ان کی گفتگو اپنے کانوں سے سنی ہے۔



کے زانو پکڑ کر ملتے انداز میں، بابا — خدا کے لیے بابا — اپنے فیصلے پر نظر ثانی سمجھے — گو کنگڑہ آپ کی اپنی ریاست ہے — آپ کی اپنی آزاد ریاست بابا — آزادی بہت بڑی نعمت ہے... بابا :  
 ماہ رخ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، میری بچی — میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے — اس آگ کو بہہ جانے کا موقع ملا ہے — اسے بہہ جانا چاہیے۔ ورنہ تمہارا بابا اس آگ میں بھسم ہو جائے گا۔

ماہ رخ : اس آگ کو بجھانے کا یہ طریقہ نہیں بابا — آپ مغلوں کی طاقت سے آگاہ ہیں۔ بیجا پور ایک سال تک مقابلہ کر سکا — پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ ہماری فوجی حیثیت تو بیجا پور سے بھی کمتر ہے۔ اس سیلاب کے آگے کیونکر ٹھہر سکیں گے۔

بابا : مسکرا کر، یہی تو میں چاہتا ہوں بیٹی —  
 ماہ رخ : بابا — آپ تباہی کو دعوت دے رہے ہیں — گو کنگڑہ تباہ ہو جائے گا۔ آزادی سلب ہو جائے گی۔ جنگ تباہی لاتی ہے بابا۔ ہزاروں گھرتباہ ہو جائیں گے — عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے — فاتح قوم اپنے رعب کا سکھ بھی جس طرح جماتی ہے آپ جانتے ہیں۔ بیجا پور کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

بابا : رہنمائی کر — لاہر واہی سے، میں خود تباہ ہو چکا ہوں — اس لیے مجھے کسی کی تباہی کی پرواہ نہیں — میری آزادی سلب کر لی گئی ہے — کیا میں اس جاگیر میں نظر بند نہیں ہوں۔ میری آزادی نہیں چھینی گئی کیا؟

ماہ رخ : یہ سب اک ظالم، جابر اور عیاش حکمران کا عمل ہے بابا — بابا : (غصے سے) اس کی اسے قرار واقعی سزا بھی ملنی چاہیے۔

بابا : (غضب ناک ہو کر) قطب شاہ والی گو کنگڑہ ہمارا دشمن نہیں کیا؟  
 افشاں : (گھبرا کر) ہے بابا —

ماہ رخ : والی ہمارا دشمن ہے — لیکن اس دشمنی کی بھینٹ پوری ریاست کو نہیں چڑھایا جاسکتا بابا — گو کنگڑہ کی آزادی کا سودا اس دشمن کے لیے نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں بابا —

بابا : میں نے جو سوچا ہے صحیح خطو ط پر سوچا ہے — عادل اور مراد مغرب ہیں میں انہیں جان بوجھ کر سہولتیں فراہم کر رہا ہوں۔ تاکہ وہ تیزی سے اپنا کام سرانجام دے سکیں — (ممنونانہ انداز میں) یہ دونوں جیلے جانبار میرے شجاع کا انتقام لیں گے — میری مضطرب اور بے چین روح کی تسکین کا سامان کریں گے۔ وہ قطب شاہ کی لاش میرے قدموں میں لاکر ڈالیں گے اور پھر (قہقہہ لگا کر) میں اس کی لاش کو ٹھوکروں سے مسخ کر دوں گا — اس دن کو اس وقت کو اس لمحے کو میں کھینچ کر اپنے قریب لے آنا چاہتا ہوں ماہ رخ —  
 ماہ رخ : (اپنے سوکھے حلق کو ہاتھ سے ملتی ہے)۔ آپ کی سوچ کا کتنا غلط انداز ہے۔

بابا : (غضب ناک ہو کر) ماہ رخ — !  
 ماہ رخ : بابا آپ اپنے انتقام کی خاطر گو کنگڑہ سے غداری کر رہے ہیں۔ اپنی سرزمین — مقدس سرزمین سے غداری —

بابا : (غصے سے) افشاں اسے لے جاؤ یہاں سے (افشاں ڈر کر آگے بڑھتی ہے)  
 ماہ رخ : میں نہیں جاؤں گی بابا — آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔ عادل اور مراد ہماری ریاست میں نقب زنی کے مجرم ہیں۔ انہیں سزا ملنی چاہیے۔ انہیں گرفتار کر کے حکومت کے حوالے کرنا چاہیے — مراد —  
 آج رات کے پچھلے پہر سب کا غذات لے کر فرار ہو رہا ہے — بابا

ماہ رخ: بابا کی بورھی آنکھوں میں تیز نظروں سے گھورتے ہوئے، تو آپ نہیں ہیں۔  
اینا فیصلہ نہیں بدلیں گے۔

بابا: تمہارے بابا کا عزم مونگے کی چٹان ہوتا ہے بیٹی —  
ماہ رخ: آپ ان دونوں کو گرفتار نہیں کریں گے!

بابا: نہیں — بلکہ بہت سے اور اہم رازان کے حوالے کر کے —  
انہیں اس خفیہ راستے سے جو سیدھا کرناٹک کی طرف جا لگتا ہے۔  
ساری سہولتیں ہم پہنچا کر وہاں سے نکال دوں گی — انہیں راستہ  
طے کرنے میں بھی کوئی دھڑکا نہیں رہے گا۔

ماہ رخ: (قہر آلود نظروں سے بابا کو دیکھتے ہوئے) ہوں!  
بابا: افشاں —

افشاں: (سہمے انداز میں) جی بابا —

بابا: ہماری لاڈلی کو لے جاؤ اور آرام سے بستر پر ٹا دو — آج ہم اتنے  
خوش ہیں کہ اس کی گستاخانہ گفتگو بھی معاف کرتے ہیں —  
جاؤ کینزوں سے کہو — اس کے سر میں روغن گل کی مالش کریں  
یہ بہت پریشان ہو رہی ہے راتھ کر ٹہکتے ہوئے، بہت جذباتی  
پہنچی ہے۔ لڑک کر اسے دیکھتے ہوئے، لیکن ہم جانتے ہیں —  
جب قطب شاہ والی گوکندہ کی خون میں نہائی ہوئی لاش ہمارے  
قدموں میں ٹھوکروں سے مسح ہونے کے لیے لائی جائے گی —  
تو ہماری بیٹی خوشی سے پاگل ہو جائے گی — کیونکہ ہم جانتے ہیں  
کہ اسے بھی شجاع سے اتنا ہی پیار ہے جتنا ہمیں — شاید  
ہم سے بھی زیادہ — اور یہ بھی انتقام کے لیے اتنی ہی بے قرار  
ہے جتنے ہم —

ماہ رخ: سزا حکران کو ملنی چاہیے — رعایا کو نہیں — اور آپ جانتے  
ہیں — جنگ کی صورت میں تباہی بربادی صرف حکمران پر  
نہیں آئے گی۔ گوکندہ کے سینے پر آگ و خون کا سیلاب بن کر  
بہے گی۔

بابا: مجھے قطعاً پرواہ نہیں۔

ماہ رخ: (چہرہ لال بھوکا ہو جاتا ہے) بابا!

بابا: (آنکھیں بند کر کے اپنی دھن میں) آندھی، زلزلے اور طوفان سب  
تختہ ہی عناصر ہیں لڑکی — اور انتقام —! انتقام ہی جذبات  
کی آندھی ہے زلزلہ ہے طوفان ہے۔ اس کی زد میں جو بھی آجائے  
مجھے پرواہ نہیں۔

ماہ رخ: (پہنچ کر) بابا! (افشاں لرزہ برآمد ہے)

بابا: افشاں — اسے لے جاؤ یہاں سے — سلا دو جا کر۔

ماہ رخ: (افشاں کا ہاتھ جھٹک کر) بابا آپ گوکندہ کی سٹی سے غداری کر رہے ہیں۔  
بابا: تمہارے سمجھانے کی ضرورت نہیں — تباہی آتی ہے —  
اور ضرور آئے گی — میرے سینے کے الاؤ صرف اسی طور ٹھنڈ  
ہو سکتے ہیں۔

ماہ رخ: یہ خود غرضی ہے بابا — اپنی ذات کے لیے اس تباہی کو نہ بلائیے۔

بابا: (خوفناک ہنسی) تباہی ضرور آئے گی۔

ماہ رخ: (وجہ شیلے عزم کے ساتھ) نہیں آئے گی — میں وقت کے چہرے  
سے وہ لمحہ فوج لوں گی جو تباہی کا نقطہ سیاہ بن کر ہماری ریاست کے  
مقرر پر پھیل جانے کو ہے۔

بابا: (دہنس دیتا ہے) بہت جذباتی ہو رہی ہے لڑکی — اٹھو —

(اسے کھڑا کرے) — جاؤ — میری بیٹی — یہ باتیں تمہارے سوچنے کی

ماہ رخ: (شعلہ جوالہ بن کر) میں انفرادی خوشی کے لیے اجتماعی مفاد کو قربان نہیں کر سکتی — نہیں کر سکتی — (غصے سے) نہیں کرنے دوں گی۔

(غصے سے بھنائی وہ کمرے سے نکل جاتی ہے — افشاں بھی اس کے پیچھے جاتی ہے — بابا پیار سے پگلی کہہ کر مسکراتے ہوئے چچوان کی منہ میں دبا لیتا ہے۔)

— :: —

(آج آدھے چاند کی نامکمل روشنی سوگوار سی ہے۔ سینہ چرخ پر پھیلے ہوئے ابر کے ٹکڑے کبھی کبھی اس مضمحل روشنی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں — ہوا سہمی ہوئی چل رہی ہے — پھپکی پھپکی چاندنی میں میر حیدر کی رہائش گاہ کسی پرانے مدفن کی طرح نظر آرہی ہے۔ ہر طرف گہرا اور معنی خیز سکوت ہے — بابا کے کمرے کی روشنیاں گل ہو چکی ہیں۔ مراد بھی سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں جا چکا ہے۔ کھلے آسمان تلے او گھٹتے شاداب چین میں ایک بڑے سے ہنفر پر عادل بیٹھا بریل کے تاروں سے سوز و گداز کی لہریں بکھیر رہا ہے اسے ماہ رخ کا انتظار ہے۔ رات ڈوبتی جا رہی ہے آج کی اہم رات)

عادل: (ربط الگ رکھ کر پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہے) ماہ رخ — آج نہیں آئی شاید — کل ناراض ہو گئی — یا خدا مجھے ہمت دے — میں آج مراد کو رخصت کر کے اپنے فرض سے سبک دوش ہو سکوں — پھر — پھر میں ماہ رخ کے حضور اپنے آپ کو بیتقاب کر دوں — وہ جو چاہے مجھے سزا دے چاہے تو ٹھکرا دے۔ چاہے تو اپنی مقدس محبت کے لہراتے آنچلوں میں پھیلا لے۔ میں ہر صورت حال

کے لیے پورے عزم سے تیار ہوں —

(قدوں کی دہلی دہلی آہٹ پر گھوم کر دیکھتا ہے — ماہ رخ آ رہی ہے — وہ والہانہ استقبال کو اٹھ کر اس کے سامنے آ جاتا ہے)

عادل: ماہ رخ! آج اتنی دیر لگا دی۔

ماہ رخ: رجب کے چہرے پر تنکھن کا غبار اور عزم کا آہنی پن ہے۔ مسکرا کر اپنے جذبات کو چھپاتی ہے، بہت راہ دیکھی؟

عادل: تین بے رحم گھنے ناگز رنگے ہیں جب کہ تم آگاہ ہو — کہ تین لمحے بھی میرے لیے کتنے اذیت دہ ہیں۔

ماہ رخ: بربط ساتھ نہیں تھا؟

عادل: میری انگلیاں بجاتے بجاتے شل ہو گئیں — کیا یہ آواز تم تک نہ پہنچ رہی تھی۔ میں تو مایوس ہو کر جا رہا تھا — ابھی —

ماہ رخ: رہنمائی ہے، وہ — رات بھر انتظار کے وعدے ریت کے گھوٹے تھے؟

عادل: رات کیا؟ — میں عمر بھر تمہارا انتظار کر کے بھی نہیں تھک سکتا ماہ رخ — لیکن کچھ کہتے ہوئے رک جاتا ہے،

ماہ رخ: (طنز پر انداز میں) لیکن آج کچھ ضروری کام تھا —

عادل: (طنز نہ سمجھتے ہوئے) تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ماہ رخ۔ ہاں مجھے آج ضروری کام ہے۔

ماہ رخ: (اطمینان سے) لیکن آج مجھے کوئی کام نہیں عادل — میں سارے جھیلے نپٹاؤں — آج۔ سحر کی غمار آلود آنکھیں بھی ہم دونوں کو یہاں اکٹھا دیکھیں گی۔

عادل: (گہرا کر) آج — آج — میں نے کہا نا مجھے ضروری کام ہے۔

ماہ رخ: (دیوانگی سے مسکرا کر) آج رات ماہ رخ کی زندگی میں پہلی اور آخری بار آئی ہے عادل آج میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی — تم بربط

بجاؤ گے — میں روح بن کر جھوموں گی — تم —

عادل: پہلی اور آخری رات کیوں ماہ رخ —؟ ایسی ہزاروں راتیں۔ لیکن تم یوں بہکی بہکی باتیں کیوں کرتے لگیں۔ تم بڑی تنکھن ہوئی معلوم ہوتی ہو۔

جا کر آرام کرو — اور تمہیں کہانا کہ مجھے کچھ ضروری کام بھی ہے۔

ماہ رخ: ماہ رخ کی قربت سے بھی زیادہ ضروری؟

عادل: تم — تم نہیں سمجھتیں —

ماہ رخ: (بیکے ہوئے شرابی کی طرح) تم ہی سمجھاؤ نا —

عادل: (منہ موڑ کر پریشانی سے ہاتھ ملتا ہے) ماہ رخ۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔

ماہ رخ: (اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) تو میں چلی جاؤں؟

عادل: (رخ پلٹ کر) کچھ دیر بعد — ابھی نہیں —

ماہ رخ: میں تو رات بھر — اس فصول خیز سے میں محبت کی خوشبو بن کر تمہارے وجود کے گرد بکھری رہنا چاہتی ہوں عادل — کام محبت کے ان جان دار لمحوں پر قربان کیے جاسکتے ہیں — کام صبح ہو جائیں گے۔

عادل: (پھر گہرا جاتا ہے) مجھے مراد سے کچھ کام ہے۔

ماہ رخ: کام کی اہمیت ماہ رخ سے بھی زیادہ ہے۔

عادل: (پریشان سے پریشان تر ہو جاتا ہے) آؤ ماہ رخ۔ اس پتھر پر بیٹھیں۔

ماہ رخ: بربط بجاؤ گے؟

عادل: نہیں باتیں کریں گے۔ دل کی باتیں۔

ماہ رخ: دل کی باتوں کے لیے تو ایک عمر بھی کافی نہیں۔ اور تم آج رات بھی مجھے پوری نہیں دے سکتے۔

عادل: آج تم کیوں بھند ہو۔

ماہ رخ: دل ہی چاہتا ہے — (ملول آواز میں) مستقبل کے سینے میں

(عادل بے بسی سے پھر دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیتا ہے۔ ماہ رخ کے چہرے پر بھوری چٹانوں کی سی سختی ہے۔ وہ خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ چند لمحے گزر جاتے ہیں۔ پھر رات کے سناٹے میں دور سے گھوڑوں کے بھاگنے کی صدا آتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ قریب آ جاتی ہے۔ ماہ رخ سختی سے اپنا گریبان پکڑ لیتی ہے۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ عادل جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے۔)

عادل: بے شمار گھوڑوں کے ٹاپ۔  
ماہ رخ: رہبرہ سفید پڑ جاتا ہے۔ عادل کے بازو کو مضبوطی سے تھام لیتی ہے (عادل) (آواز ڈوب جاتی ہے)۔

عادل: (آوازیں قریب پہنچ رہی ہیں۔ ماہ رخ کو سنبھالتے ہوئے) گھبراؤ نہیں ماہ رخ۔ شاید کوئی لشکر ادھر سے گزر رہا ہے۔

ماہ رخ: اس کے کندھے سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے (محبت اک آفاقی جذبہ ہے۔ روحانی قدر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن فرض اس سے بھی شاید مقدس جذبہ ہے۔ جو یہ آفاقی جذبہ اور روحانی قدر اس پر قربان کر دی جاتی ہے۔)

عادل: اس کی طرف ہر سال ہو کر دیکھتا ہے۔ پھر اسے پیار سے الگ کر کے یقیناً تم میرے فرض سے آگاہ ہو چکی ہو۔ (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) میرا۔۔۔ میرا فرض۔

ماہ رخ: (اس کے بالمقابل کھڑے ہو کر) اور۔۔۔ ابھی۔۔۔ چند لمحوں بعد تم میرے فرض سے بھی۔۔۔ آگاہ ہو جاؤ گے۔

عادل: (ماہ رخ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے) کیا مطلب؟ (گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں رہائش گاہ کے چاروں طرف

ہمارے لیے خدا جانے کیا پوشیدہ ہے۔ میں وقت کی اس دھارا پر بے خبر ہو کر بہہ جانا چاہتی ہو عادل جو خدا جانے کن اندھیروں میں ڈوبنے کے لیے بہہ رہی ہے۔

عادل: تمھاری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔ بہت مایوسی کی باتیں کر رہی ہو۔ ماہ رخ: (ردوب کر) میں مایوس نہیں ہوں عادل۔ میں عزم و استقلال کی زندہ تصویر ہوں۔ میں گو کندھ کی آہنی ارادے رکھنے والی جانا بیٹی ہوں۔ عادل: (پریشاں ہو کر اسے دیکھتا ہے پھر پتھر پر بیٹھتے ہوئے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیتا ہے) ماہ رخ آج تم خدا جانے کیسی باتیں کر رہی ہو۔

ماہ رخ: اس کے قریب بیٹھتے ہوئے) تم انتہائی زیرک۔۔۔ انتہائی ذہین انسان بھی میری باتیں نہیں سمجھ سکتے۔ اپنے آپ سے (واقعی۔ کوئی کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔ انسان خارجی عوامل کے سہارے ایک دوسرے کے خیالات کا تعین کر سکتا ہے۔ باطنی طوفانوں سے آگاہ ہی کبھی نہیں ہو سکتی۔

عادل: (بے یقینی اور حیرت سے اسے دیکھتا ہے) کیا تمھیں علم ہو گیا ہے کہ ماہ رخ: (رہنستے ہوئے) کہ تم اپنی محبت میں ایمان دار نہیں۔

عادل: یہ میرے جذبات کی توہین ہے۔  
ماہ رخ: (رہنستے ہوئے) محبت بڑا نرم و نازک جذبہ ہے عادل۔ (بے اختیار) یہ تو ذرا سے سائے سے بھی گھٹنا جاتا ہے۔ تم نے تو مجھ سے اپنا آپ بھی پوشیدہ رکھا۔

عادل: (عاجز اگر) ماہ رخ۔۔۔ تم کل والی باتوں سے ناراض معلوم ہوتی ہو۔ بخدا۔۔۔ آج رات گزر جانے دو۔۔۔ کل میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا سب کچھ۔۔۔ کل سب کچھ۔

ماہ رخ: (متانت اور سنجیدگی سے) آج کبوں نہ۔

عادل: (بیچ کر) ماہ رخ —

(ماہ رخ پلٹ کر نہیں دیکھتی۔ عادل پوری طرح کچھ سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ عمارت کی طرف بھاگتا ہے — شاہی فوج کے کئی سپاہی ننگی تلواریں لہراتے چاروں طرف سے لپکتے ہیں۔)

سے آتی ہیں،

ماہ رخ: (دو دونوں ہاتھوں میں عادل کا چہرہ تھام کر اس کی حیران آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔ بڑے کرب سے مسکراتے ہوئے) اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ہی قابل احترام ہیں عادل — کہ ہم نے اپنے اپنے فرض سے آنکھیں نہیں پھرتیں۔

عادل: (رسخت اضطراب میں) تم کیا کہہ رہی ہو — میں سمجھا نہیں —

ماہ رخ: (اسی دیوانہ انداز میں) تم نے فرض ادا کیا — میں نے بھی فرض ادا کیا — باقی رہے دل کے معاملے — تو بعض دل شاید قدرت نے جلنے کے لیے ہی بنائے ہیں (قدرے رک کر) عادل! — میں نے تمہیں — محبت کی شدتوں اور عشق کی انتہاؤں تک چاہا ہے۔

عادل: ماہ رخ (اسے بازوؤں میں سمیٹ لیتا ہے —)

ماہ رخ: (چند لمحے بے سدھ سی ہو جاتی ہے —) عادل — (بے اختیار ہو کر رو دیتی ہے)

(گھوڑوں کے آتشیں ٹاپ آواز پیدا کر رہے ہیں۔ تلواروں کی جھنکار کے ساتھ ہی کچھ مہم اور غیر واضح سی آوازیں ابھرتی ہیں۔)

عادل: (پریشان ہو کر) ماہ رخ یوں لگتا ہے — کہ سوار رہائش گاہ کے گرد اگر دکھڑ گئے ہیں۔

ماہ رخ: (اس کے سینے سے سر اٹھاتے ہوئے) خدا حافظ عادل۔ (جائے لگتی ہے آنکھیں نم ہیں)

عادل: ماہ رخ — رکو — ذرا ٹھہرو۔

ماہ رخ: (ریٹے بنا) وقت ہو چکا — شاہی فوج پہنچ گئی ہے — ہماری رہائش گاہ محاصرے میں ہے۔

میر حیدر: (پارے کی طرح مضطرب) ماہ رخ کی ایسی جرات۔ ہماری راہ میں حائل ہونے کی گستاخی۔

سالار: (حیرانگی سے) میر حیدر۔ کیا آپ کو ان دشمنوں کو گرفتار کروا کے خوشی نہیں ہوئی۔ میر حیدر! میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میں ان دونوں کی سرگرمیوں سے لاعلم نہیں تھا۔ عادل اور مراد دونوں حیرت سے بابا کو دیکھتے ہیں۔ سالار: (ایک قدم آگے بڑھا کر) تو گویا آپ نے دانستہ انہیں پناہ دی۔

میر حیدر: ہاں (عادل اور مراد دونوں پھر حیرت سے بابا کو دیکھتے ہیں۔) سالار: (حیرت سے) آپ ان کے ساتھ سازش میں شریک تھے۔ میر حیدر: میرا جواب نفی میں نہیں ہے۔ (مراد اور عادل پھر بیقرار ہو کر بابا کی طرف دیکھتے ہیں)

سالار: آپ میری حراست میں ہیں۔

میر حیدر: (خشم ناک ہلچے میں) میں جانتا ہوں۔

سالار: (دو سپاہیوں سے) رجب خاں اور سرور علی زنجیریں لاکر میر حیدر کو پھانسی۔ (پس پردہ ماہ رخ پہنچ اٹھتی ہے۔ بابا —) عادل بیقراری سے ادھر دیکھتا ہے۔

میر حیدر: (گرفتاری کے لیے ہاتھ پیش کرتے ہوئے) سالار۔ تم مجھے زنجیریں پہنا سکتے ہو۔

ماہ رخ: (بیخ کر) بابا — میرے بابا —

(سب دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جس کا پردہ ہٹا ہوا ہے اور ماہ رخ افشاں کے ہاتھوں سے نکل کر بابا تک آنے کی جدوجہد کرتی نظر آتی ہے —) سائول بھی اسے تھامنے کی کوشش کر رہی ہے۔) میر حیدر: (آنکھوں سے شعلے پکٹتے ہیں۔ ماہ رخ کو دیکھ کر چہرہ سرخ ہو جاتا ہے وہ مضطرب ہو کر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر سالار کی طرف دیکھتا ہے)

(میر حیدر کی سب سے بڑی نشست گاہ۔ زرہ بکتر پہنے سروں پر خود جھائے سپاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ عادل اور مراد پایہ زنجیر سر جھکائے سب کے درمیان کھڑے ہیں۔ میر حیدر غصے سے دیوانہ ہو رہے ہیں۔ سالار اعلیٰ ان کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی میان میں تلوار لٹک رہی ہے۔ بابا کے کمر بند کے ساتھ زنجیر ہے۔ بابا کے گھیر دار کڑے نے زنجیر کو چھپا رکھا ہے۔ سپاہی تلواریں سونتے کھڑے ہیں۔ ان کے چہروں پر تبسم ہے۔ سامنے والے دروازے کے پس پردہ ماہ رخ افشاں کے بازوؤں میں سسگ رہی ہے۔ حویلی کے سب خدام اور کینیزیں شاہی فوج کی زیر حراست ہیں)

سالار: (میان پر ہاتھ رکھتے ہوئے) میر حیدر — آپ کی بہادر اور جانناز بیٹی ہمیں بروقت مطلع نہ کرتی — تو یہ دونوں آج ہمارے پیش قیمت لالچے کو فرار ہو جاتے۔

(عادل اور مراد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ مراد حیران نظر آتا ہے۔ اور عادل کو جیسے کہہ سکتے ہو جاتا ہے —)

میر حیدر: (غضب ناک ہو کر) تو یہ اطلاع تمہیں ماہ رخ نے ہم پہنچائی۔ سالار: (احترام سے سر جھکا کر) ہم گو لکندہ کی اس عظیم بیٹی کو سلام کرتے ہیں۔



میر حیدر : (آنکھوں سے جیسے خون رِس رہا ہے۔ چہرے پر خشونت ہے۔ دانت پیس کر) تو تم نے یہ سارا اگل کھلایا۔

ماہ رُخ : (دوتے ہوئے) ہاں بابا۔ اک محبت وطن بیٹی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ خود جا کر سالار کو مطلع کرے۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے بابا۔ (افشاں بھی روتی ہے اور سانولی بھی)

میر حیدر : (آنکھوں میں آگ ابھرتی ہے۔ چہرہ خوفناک ہو جاتا ہے۔) تو نے تو میرے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کی ہے۔

ماہ رُخ : (دوتے ہوئے) یہ میرا فرض تھا بابا۔

میر حیدر : یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ راہ میرے انتقام کی راہ ہے۔ (گر جتا ہے) ناہنجار لڑکی۔ تو نے بنا بنایا کام یوں بگاڑ دیا

ماہ رُخ : (بہم کر) بابا۔!

میر حیدر : (خبر نکال کر) میرا انتقام ادھورا رہ جائے اور میں تجھے چھوڑ دوں۔ (خبر لہراتا اور پھر ماہ رُخ کے سینے میں اتار دیتا ہے) ہونہ۔

عادل : (تڑپتی ہوتی چیخ) با۔ با۔۔۔ (زنجیریں توڑ کر دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش میں اوندھے منہ گرتا ہے۔ ماتھے سے خون بہنے لگتا ہے۔)

ماہ رُخ کی کرب ناک چیخ افشاں اور سانولی کی چیخوں میں گم ہو جاتی ہے)

میر حیدر : (گر جتا ہوتے خوفناک آواز میں) میرے انتقام کی راہ میں حائل ہونے کی تجھے جرأت کیسے ہوتی۔ ناہنجار لڑکی۔

(نشست گاہ میں شور مچ جاتا ہے۔ مراد بے بسی سے تڑپتا ہے۔ اور زخمی عادل کی دیوانہ وار چیخیں ماہ رُخ کے الفاظ میں ڈھل رہی ہیں۔ سالار اور سپاہی

حیرت سے سارا منظر دیکھ رہے ہیں۔ سالار بالآخر آگے بڑھتا ہے۔

اس دروازے کی طرف جاتا ہے۔ جہاں افشاں اور سانولی لمو میں نہائی ماہ رُخ پر ہلکی تڑپ رہی ہیں۔ اور میر حیدر بُت کی طرح کھڑا ہے۔ سالار ماہ رُخ پر

میں گرفتاری سے پہلے اپنی بیٹی سے ملنے کی اجازت چاہوں گا رجوش سے) وہ سامنے ہی کھڑی ہے۔ سالار: آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔

میر حیدر برق رفتاری سے ادھر جاتا ہے۔ سب کی نظریں ادھر اٹھ جاتی ہیں۔ عادل کی مجبور بے بسی دید کے قابل ہے۔ ماہ رُخ تڑپ کر افشاں کے بازوؤں سے نکل کر دوتے ہوئے بابا سے پیٹ جاتے کو دوڑتی ہے)

ماہ رُخ: (ہچکیاں لیتے ہوئے) بابا!

# خوبصورت اور دلکش کتابیں

ایک نظر ڈالتا ہے۔ پھر میر حیدر کا کندھا جھنجھوڑتا ہے —  
 سالار : یہ کیا ظلم کیا میر حیدر — گو کندہ کی عظیم بیٹی تو تعظیم کے لائق تھی۔ آپ  
 نے — (اس کے کچھ اور کہنے سے پہلے ہی حیدر کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔  
 اور پھر اس کے قمقمے بلند سے بلند تر ہوتے جلتے ہیں — سالار سپاہیوں اور  
 مراد کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر سالار ادب  
 سے آگے بڑھتا ہے تعظیم سے جھکتا ہے اور ماہ رُخ پر اس کا دوپٹہ ڈال کر  
 سیدھا کھڑا ہو کر سپاہیوں کو حکم دیتا ہے —  
 سالار : (بارعجب آواز میں) گو کندہ کی اس بہادر بیٹی کو تعظیم دی جائے۔  
 (سپاہی سیدھے کھڑے ہو کر سر جھکاتے اور اپنی تلواریں زمین کی طرف کر دیتے  
 ہیں۔ عادل کی تڑپ اور بابا کے قمقمے سونگوار جمود کو توڑتے رہتے ہیں)۔

(رضیہ بٹ)

رابی  
 میں کون ہوں  
 رائگ نمبر  
 زندگی

ناجیہ  
 گل بانو  
 آئیڈیل  
 ثمنینہ

سارہ  
 رفاقتیں کیسی  
 ریشم  
 رُوب  
 فاصلے

آئینہ  
 شائینہ  
 شیخو

ماہ رُخ

کمانڈو جی جی

قلو پترہ کے دیس میں  
 پیرس کی گلیاں

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

رضیہ بٹ

اے حمید	خانہ بدوش کے خطوط
اے حمید	برف باری کی رات
اے حمید	ویران جزیرے
اے حمید	چائے والا
اے حمید	سیاہ بھول
اے حمید	آدھی رات کا شہر
اے حمید	جھیل اور کنول
اے حمید	دھوپ اور شگونے
اے حمید	ڈربے
اے حمید	جنگل روتے ہیں
اے حمید	جاپان کی ڈمپل
اے حمید	زیتون کی وادی
اے حمید	بارش اور بالکونی
اے حمید	چاند پھر نکلے گا
اے حمید	گلاب کی ٹہنی
اے حمید	کمانڈو (سات حصے)
قرنقوی	شکار بیتی
قرنقوی	شکار نامہ
قرنقوی	امریکہ میں شکار